MARCH
2026

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ بیاض لاہور

5 جون 1943
13 مارچ 2013

جناب اجمل نیازی، جناب خورشید رضوی، محترمہ ڈاکٹر ناہید قاسمی، جناب جسٹس شیخ ریاض،
جناب خالد احمد، جناب اعجاز رضوی

جناب خالد احمد اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ

جناب شوکت علی شاہ، جناب خالد احمد، جناب انور سجاد

احمد ندیم قاسمی کے لیے

کوئی فن ، کوئی پیرایہ ، ترے شایاں نہیں پایا
تجھے میں نے چھوا ، لیکن بہت محتاط نظروں سے

تری سج دھج نے میرے بے ہنر جذبوں کو مہکایا
کوئی فن ، کوئی پیرایہ ، ترے شایاں نہیں پایا
پس الفاظ ، دل رکھ کر ، ترے عکسوں کو دہرایا
تجھے میں نے گزارا ان گنت آئینہ خانوں سے

کوئی فن ، کوئی پیرایہ ، ترے شایاں نہیں پایا
تجھے میں نے چھوا ، لیکن بہت محتاط نظروں سے

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ Karachi: (021) 34541301-7 ■ Lahore: (042) 37603901-9
■ Sialkot: (052) 3554301-6 ■ Rawalpindi/Islamabad: (051) 5162704-5
■ Faisalabad: (041) 8542924 ■ Peshawar: (091) 5252311 ■ Multan: (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 34 - مارچ 2026 - شمارہ نمبر: 3

مدیر اعلیٰ: عمران منظور

مدیر: نعمان منظور

مجلس ادارت	اعجاز رضوی	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: خالد احمد

قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں
فیصل بینک لمیٹڈ
ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور
A/c Title: Monthly BAYYAZ
اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور-53700

فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ
www.trackntie.com
BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر پبلشر اور پرنٹر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹر [illegible] اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	سید ریاض حسین زیدی، سرور حسین نقشبندی، اعجاز رضوی	7 تا 9
2	نعت	نسیم سحر، خاور اعجاز، افروز رضوی، احمد جلیل، نبیل احمد نبیل سرور حسین نقشبندی	10 تا 15
3	عقیدت	اکرم ناصر، مرزا آصف رسول، اکرم سحر فارانی، فیض رسول فیضان رانا اورنگ زیب عالمگیر، درخشندہ نوید	16 تا 21
4	قطعات	اجمل اعجاز	22
5	رباعیات	گلزار بخاری، سعید اشعر، محمد نصیر زندہ	23 تا 25
6	ہائیکو	آفتاب خان	26
7	ذکرِ یار گوشہ خالد احمد بمعہ شاعری، نظمیں، غزلیں	مضامین: جمیل احمد عدیل، زاہد حسن، نوید صادق	27 تا 47
		شاعری: خالد احمد	48 تا 68
8	افسانے	بلقیس ریاض، محمد اویس بیگ، نعمان منظور، شاہدہ دلاور شاہ عائشہ احمد جاوید، سید تحسین گیلانی، طوبیٰ صدیقی ناز اوکاڑوی، ظہور احمد	69 تا 103

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
9	غزلیں	جلیل عالی، نسیم سحر، خاور اعجاز، اعجاز کنور راجہ سید ریاض حسین زیدی، راحت سرحدی، صفدر صدیق رضی شریف ساجد، عقیل رحمانی، گلزار بخاری، احمد جلیل افتخار شاہد، رضا اللہ حیدر، اقبال سروبہ، سعداللہ شاہ عافر شہزاد، قیوم طاہر، افروز رضوی، افتخار یوسف، اظہر عباس قیصر مسعود، اصغر علی بلوچ، خالد و انور، مسعود احمد، عاصم اعجاز انیس احمد، فیض رسول فیضان، شوکت محمود شوکت، اعجاز دانش عون الحسن غازی، اکرم جاذب، ہمایوں پرویز شاہد، ظہور چوہان میتھیو محسن، امجد بابر، اسد رضا سحر، نبیل قیصر، نائلہ راٹھور نوید عاجز، امر مہکی، امجد خان تجوانہ، جمشید کمبوہ، عابد رضا سید تیمور کاظمی، ثمر جمال، کوکی گل، رانا محمد شاہد، غضنفر مہدی عزیز عادل، جیا قریشی، محمد اشفاق بیگ، خالق آرزو ناصر علی ناصر، مسکان گل	104 تا 157
10	مضامین	جلیل عالی، خاور اعجاز، نسیم سحر، فرحت عباس شاہ، حامد یزدانی مسرت کلانچوی، جمیل احمد عدیل، طارق بٹ، شوکت محمود شوکت رخشندہ نوید، پروین سجل، نادیہ عنبر لودھی، فرح سنبل ارسداریب، رحمان حفیظ، کلیم اللہ زاہد، عبدالعزیز ملک، ماریہ اعجاز	158 تا 229
11	نظمیں	جلیل عالی، شبہ طراز، اکرم سحر فارانی، محمد انیس انصاری نائلہ راٹھور، سید فرخ رضا ترمذی، شبیر آکاش، خالق آرزو بشریٰ شیریں، امجد بابر، نعمان منظور	230 تا 241

حمد

توحید کا کچھ اس طرح اظہار ہو گیا
روز ازل سے شرک کا انکار ہو گیا

فضل خدا سے جس کو ملا قلب مطمئن
رشک آفرین ، صاحب کردار ہو گیا

خلاق لم یزل کی جسے جستجو رہی
وہ حق شناس صاحب اسرار ہو گیا

اس کی طرف نگاہ رہے جس کی مرتکز
وہ پاک باز کیسا نگہ دار ہو گیا

جس نے خدائے پاک کو دل میں بسا لیا
سمجھو وہ ہر گناہ سے بے زار ہو گیا

اس کے مقام عشق کو لاکھوں سلام ہوں
حب الٰہ سے جو کوئی سرشار ہو گیا

ہو راہ مستقیم سے کوئی نہ منحرف
قرآں کے حرف حرف کا اصرار ہو گیا

طوفان اضطراب میں جب ان سے کی دعا
بیڑا بس ایک پل میں مرا پار ہو گیا

میرے ریاض حمد میں ضو پھوٹنے لگی
میں حمد گو تھا ، صاحب انوار ہو گیا

سید ریاض حسین زیدی

حمد

آنکھوں میں کوئی حرفِ دعا لکھا ہوا ہے
پیشانی پہ یہ کس کا پتا لکھا ہوا ہے

یہ جال رگوں کا ہے کہ مکتوب ہے کوئی
کچھ بھی سمجھ آتا نہیں کیا لکھا ہوا ہے

اک راز کی مانند ہیں چہرے کے خدوخال
ہر نقش پہ حیرت کا پتا لکھا ہوا ہے

ہاتھوں کی لکیروں کو کبھی غور سے دیکھو
لگتا ہے کوئی عہدِ وفا لکھا ہوا ہے

تو اپنے شب و روز میں الجھا ہے مگر دیکھ
رگ رگ پہ تری قالوا بلیٰ لکھا ہوا ہے

ہر سانس میں اُترى ہے مہک نام خدا کی
دھڑکن میں بھی اس کا ہی پتا لکھا ہوا ہے

گر چیر کے دیکھو تو نظر آئے گا سرور
اس دل پہ فقط نام خدا لکھا ہوا ہے

سرور حسین نقشبندی

حمد

پھولوں میں رنگ خاک پہ سبزا اُسی کا ہے
وہ مالک و معمار ہے نقشہ اُسی کا ہے

بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھاتا ہے صرف وہ
پگڈنڈیاں بہت سی ہیں رستہ اُسی کا ہے

کتنا بھی زور و زر ہو مگر اس زمین پر
ہم خار و خس کی کشتیاں دریا اُسی کا ہے

جلتے ہوئے دِیے نے کہا، روشنی سے پوچھ
سورج میں چاند تاروں میں جلوہ اُسی کا ہے

زروں کی بھیڑ بھاڑ سے اس کو غرض نہیں
وہ مالک و مختار ہے صحرا اُسی کا ہے

اعجاز ہم نے غور سے دیکھا نہیں یہاں
ورنہ ہر ایک چیز میں جلوہ اُسی کا ہے

اعجاز رضوی

نعتؐ

تازگی بخش سب اسباب کا ہمسایہ ہوا
آپؐ کے دستِ شفایاب کا ہمسایہ ہوا

درِ آقاؐ پہ پہنچتے ہی مرے دل نے کہا
''میں کہاں انجم و مہتاب کا ہمسایہ ہوا!''

گنبدِ سبز نگینہ سا لگا ہے مجھ کو
مَیں تو اِک گوہرِ نایاب کا ہمسایہ ہوا

لوگ دیکھا کیے حیرت سے مجھے طیبہ میں
روشنی بانٹتے ابواب کا ہمسایہ ہوا

جب بھی باغاتِ مدینہ کی زیارت کی ہے
یوں لگا ، سبزۂ شاداب کا ہمسایہ ہوا

آپؐ کے قریۂ نوری میں قدم رکھتے ہی
آپؐ کے حلقۂ اصحاب کا ہمسایہ ہوا

ایسی ہمسائیگی پر میرے دل و جاں ہیں نثار
گنبد و منبر و محراب کا ہمسایہ ہوا

طیبہ میں حاضری دینے کا یہ فیضان ہوا
مجھ سا جاہل ادب آداب کا ہمسایہ ہوا

میں نے اُس نور نگر میں جو قدم رکھا نسیمؔ
کسی اَن دیکھے ہوئے خواب کا ہمسایہ ہوا

نسیمِ سحر

نعتؐ

وہی مصطفیٰؐ ، مجتبیٰؐ بھی وہی
خدائی میں نُورِ خدا بھی وہی

ہر اِک زخمِ دل کا مداوا ہیں وہؐ
ہر اِک درد کی ہیں دوا بھی وہی

بہر گام جنؐ کے لیے مشکلیں
زمانے کے مشکل کُشا بھی وہی

جو اُنؐ کا ہُوا وہ خدا کا ہُوا
کہ منزل بھی وہ راستا بھی وہی

وہیؐ صبحِ صادق کی پہلی کرن
شبِ تار میں ہیں دیا بھی وہی

وہؐ اذہان کے واسطے نُور ہیں
دلوں کے لیے حوصلہ بھی وہی

اُنہیؐ سے ہے اُمیدِ لطف و کرم
کہ ہیں شاہِ شاہ و گدا بھی وہی

خاور اعجاز

نعتؐ

گُلِ مدحت جو اب کِھلنے لگے ہیں
اِشارے نعت کے ملنے لگے ہیں

میں جالی تھام کر آقا کی روئی
مرے زخمِ جگر سِلنے لگے ہیں

بُلاوا عرش سے آیا نبی کا
زمین و آسماں ہلنے لگے گا

دِوانہ وار طیبہ کا سفر ہے
مجھے کیا پاؤں گر چھلنے لگے ہیں

نبی کی یاد میں افروز گُم ہے
خیالوں کے کنول کِھلنے لگے ہیں

افروز رضوی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تو نے ہر شخص کی تقدیر میں عزّت لکھی
آخری خطبے کی صورت میں وصیّت لکھی

نعتؐ

جب بھی الہام نعت ہوتی ہے
روبرو اُن کی ذات ہوتی ہے

باوضو لفظ لفظ ہوتا ہے
با ادب بات بات ہوتی ہے

جب بکھرتے ہیں گیت مدحت کے
وجد میں کائنات ہوتی ہے

کملی والے کی رحمتوں کے طفیل
عاصیوں کی نجات ہوتی ہے

اُن کی سوچوں میں دن گزرتا ہے
اُن کی یادوں میں رات ہوتی ہے

کب میں تنہا جلیل ہوتا ہوں
یاد آقا کی ساتھ ہوتی ہے

جس کی جانب جلیل ہوں آقا
اُس کی تو کائنات ہوتی ہے

احمد جلیل

نعتؐ

ایسے وہ نام دیدہ و دل پر رقم ہوا
ذکرِ رسولؐ پاک سدا ، دم بہ دم ہوا

آیا ہے اپنے ہاتھ میں دامانِ مصطفےٰؐ
اوقات کیا تھی اپنی خُدا کا کرم ہوا

مجھ پر نگاہِ لُطفِ نبیؐ جب سے ہوگئی
میں دشمنوں کی آنکھ میں بھی محترم ہو

رستے غموں کی بھیڑ سے نکلے ہزار ہا
دہلیزِ مصطفےٰؐ پہ مرا سر جو خَم ہوا

نعتِ نبیؐ سے شہرِ سخن میں ہوں معتبر
ہر شعر میرا زینتِ لوح و قلم ہوا

مدّت سے خشک تھی مری آنکھوں کی سرزمیں
ذکرِ رسولؐ سُن کے علاقہ یہ نَم ہوا

جیسے نصابِ عشق میں چاہا خُدا نے ہے
عشقِ خُدا میں عشقِ نبیؐ ایسے ضم ہوا

نکلا ہوں بار بار مدینے کی سمت میں
مجھ پر ہزار بار خُدا کا کرم ہوا

قریہ بہ قریہ آپؐ کے اوصاف کا ہے ذکر
ہر سمت سربلند نبیؐ کا عَلَم ہوا

مجھ کو نبیل اِتنا ملا اُنؐ کے فیض سے
کرتا رہا میں خرچ مگر کچھ نہ کم ہوا

احمدؐ کا اسم مل گیا اسمِ نبیل سے
اس نام پاک سے مرا قائم بھرم ہوا

نبیل احمد نبیل

نعتؐ

خیال پر بہار ہے مدینے آ گیا ہوں میں
عجیب سا خمار ہے مدینے آ گیا ہوں میں

مری بساط ہی نہیں کہ یاں تلک پہنچ سکوں
عطائے کردگار ہے مدینے آ گیا ہوں میں

دل و نظر کی بے کلی کا دور تک نشاں نہیں
قرار ہی قرار ہے مدینے آ گیا ہوں میں

کرم نوازیوں کا شکر ہو ادا تو کس طرح
بس آنکھ اشکبار ہے مدینے آ گیا ہوں میں

جہاں سے اذن پا رہے ہیں نکہتوں کے قافلے
وہ صبح نو بہار ہے مدینے آ گیا ہوں میں

جہاں پہ سرور آ کے بس سکون ہی سکون ہے
یہی وہ خلد زار ہے مدینے آ گیا ہوں میں

سرور حسین نقشبندی

عقیدت

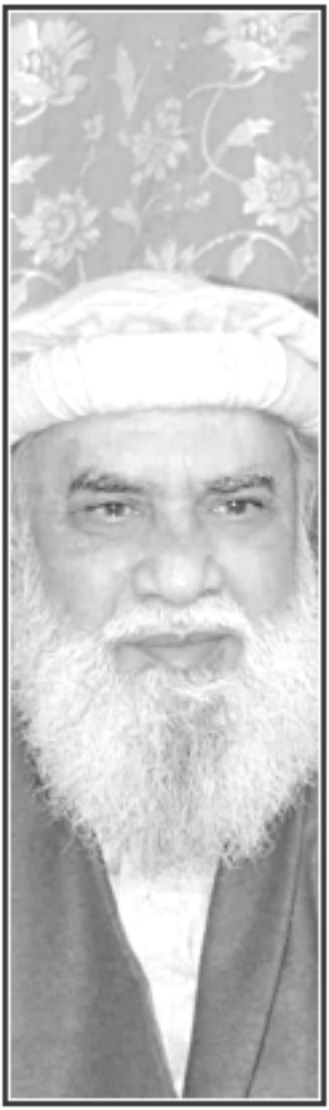

ساری دنیا ہو مرے مولا مرے من سے پرے
پر نہیں رکھیو کبھی طیبہ کے گلشن سے پرے

نہ کوئی پہلے گیا ہے نہ کوئی بعد گیا
ایک بس آپ ہیں جو پہنچے ہیں چلمن سے پرے

ایک اعلان ہوا آؤ سرِ عرشِ بریں
ہم نے ساجن کو نہیں رکھنا ہے ساجن سے پرے

ایک اک کر کے چنے آپ کے ساتھی سارے
وہ جو رکھتے تھے سدا دوست کو دشمن سے پرے

سارے غدار منافق سبھی کافر مشرک
ایسی چنگاریاں سب رکھی ہیں خرمن سے پرے

آپ کے دامنِ رحمت میں جو آئے، خوش بخت
اور بدبخت ہیں رہتے ہیں جو دامن سے پرے

اکرم ناصر

عقیدت

ہے ربِّ کُن کے صلِّ علیٰ سے یہ کائنات
اُس کے بھی وہ مکیں ہیں جو ہے لامکاں کوئی

یہ صرف اُن کے نعت سے ہے زینتِ خیال
نورِ یقین ہے پھر کہاں؟ اے دل! گماں کوئی

طوبیٰ جہاں ہے چھوڑ دیں، عاشقوں کے ہاں
طیبہ پہ ہے فدا، ہے کہیں گر جناں کوئی

میں دیکھوں اپنے دل کی بھی اس میں روانگی
سوئے مدینہ چلتا ہے جب کارواں کوئی

اپنی اُمم کو دے کے گئے مژدہ انبیاؑ
آئے گا اُن کے بعد شہِ مرسلاں کوئی

ختم الرسل ہے وہ، ہے وہی سید الامم
آگے ہے پھر سب اس کا، ہے جو بھی زماں کوئی

مابینِ خلق و خالق اگر ہیں تو مصطفیٰ
اللہ، مصطفیٰ کے نہیں درمیاں کوئی

آنا ہے پھر حریمِ محمد میں ہی اِسے
گر زندگی کو چاہیے غم سے اماں کوئی

یہ دُور و نزد کی ہیں منازل ہمارا غم
آقا کے لطف میں تو نہیں این و آں کوئی

میرِ اُمم کی بیویاں امت کی اُمہات
سب پہ سلام اُن سے نہیں بڑھ کے ماں کوئی

کر دے جو خود کو صلِّ علیٰ کے سپرد اُسے
نے سود کی طمع ہے نہ خوف زیاں کوئی

حسان ہے کہ جامی و عرفی کہ ہے رضا
بخشے ہیں سب کو نعت نے نطق و زباں کوئی

یارب! عطا مجھے بھی ہوں آنکھیں کہ دیکھ لوں
'باغ و بہارِ صلِّ علیٰ' کا سماں کوئی

مولیٰ! بہ حقِ صلِّ و سلّم سرِ سخن
آصف کو بھی نصیب ہوں صدق و لساں کوئی

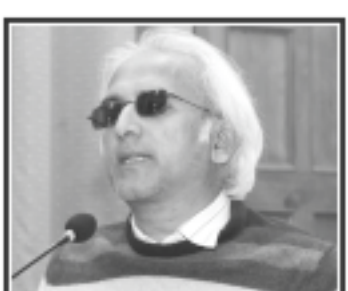

مرزا آصف رسول

عقیدت

اکرم سحر فارانی

ساگر ہے رحمتوں کا ہے صبر کا قرینہ
اللہ کی عطا ہے رمضان کا مہینہ

توبہ کے دَر کھلے ہیں شیطان قید میں ہیں
رمضان کا ہر اِک پل خُلدِ بریں کا زینہ

آنکھوں میں ضَوفشاں ہے زُہد و وِلا کی تابش
کرنوں سے اِس کی روشن ہر دل کا آبگینہ

مومن کی ڈھال ہے یہ اِس رزم گاہِ شَر میں
ہیبت سے اِس کی آئے شیطان کو پسینہ

طوفان دہشتوں کا سَرکش ہے تیز رَو ہے
یا رب لگا کنارے اس قوم کا سفینہ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جتنی بار اُس طرف نگاہ اُٹھی
روح تک ہم لرز گئے ہر بار

عقیدت

جب بھی میں نے پکارا علیؓ یا علیؓ
ہر بلا میرے سر سے ٹلی یا علیؓ

پنجتنؓ پاک کے ذکر کے فیض سے
کھِل اُٹھی میرے دل کی کلی یا علیؓ

آپ کا مرتبہ ہے وراء الوریٰ
آپ ہیں دینِ حق کے ولی یا علیؓ

سن کے ''من کنت مولا'' نبی پاک سے
سمجھے ہم تیری شانِ جلی یا علیؓ

لے خدارا خبر ، صدقہ حسنینؓ کا
اب تو باندی تیری مر چلی یا علیؓ

کیسے کیسے دِیئے بُجھ گئے ہیں مگر
شمع تیری رہے گی جلی یا علیؓ

مل گیا جس کو تیری مودّت کا نم
بس وُہی شاخ پھولی پھلی یا علیؓ

رشک سے چاند تاروں نے دیکھا مجھے
خاک در جب جبیں پر ملی یا علیؓ

تخت سے، تاج سے، دُنیوی راج سے
تیرے در کی غلامی بھلی یا علیؓ

جب بھی آنسو بہائے تیری یاد میں
شب غموں کی یکایک ڈھلی یا علیؓ

ایک میں کیا ہوں کیا میری اوقات ہے
تیرے ٹکڑوں پہ خلقت پلی یا علیؓ

کعبہ فیضانؔ کو یاد آنے لگا
دیکھ کر تیرے در کی گلی یا علیؓ

فیض رسول فیضان

عقیدت

کردار کہہ رہا ہے کہ اسلام تھا حسین
حرّیتِ دوام کا انعام تھا حسینؓ

باطل کے روبرو جو ڈٹا ، سربلند ہے
ہر دور کے ضمیر کا پیغام تھا حسینؓ

جو کربلا کی خاک پہ لکھی ہے داستاں
عزمِ صمیم قلب کی اک شام تھا حسینؓ

شمشیر کے بغیر بھی فاتح رہا ہے وہ
اور آبروئے عشق کا گل فام تھا حسینؓ

اپنے لہو سے آپ نے پاس وفا رکھا
عملاً جہادِ عشق کا الہام تھا حسینؓ

پیمان عشق آپ کا عالم ہے مانتا
اسلام کے وقار کا اتمام تھا حسینؓ

رانا اورنگ زیب عالمگیر

نعتیہ نظم

وقت ایسے ہزار بار آئے
جب سکوں چار سُو نہیں ملتا
کوئی امید بر نہیں آتی
آس کا پھول بھی نہیں کھلتا

ایسے لمحے میں ایسا لگتا ہے
جیسے عالم میں آسرا بھی نہیں
اکثر ایسا گمان ہوتا ہے
آسماں پر کہیں خدا بھی نہیں
اس پشیمانیٔ تمنا میں
ہم نے بھی آزما کے دیکھا ہے
جب کبھی دل ملول ہوتا ہے
اسمِ احمد کے نور و برکت سے
رحمتوں کا نزول ہوتا ہے

ذکرِ محبوبِ ربِ دو عالم
مشکلوں کی گھڑی میں کام آئے
چاک دامن بھی ہو رفو از خود
زندگانی بھی آسرا پائے
پھول ہی پھول ہوں سرِ ہستی
لب پہ جب بھی نبیؐ کا نام آئے

رخشندہ نوید

قطعات

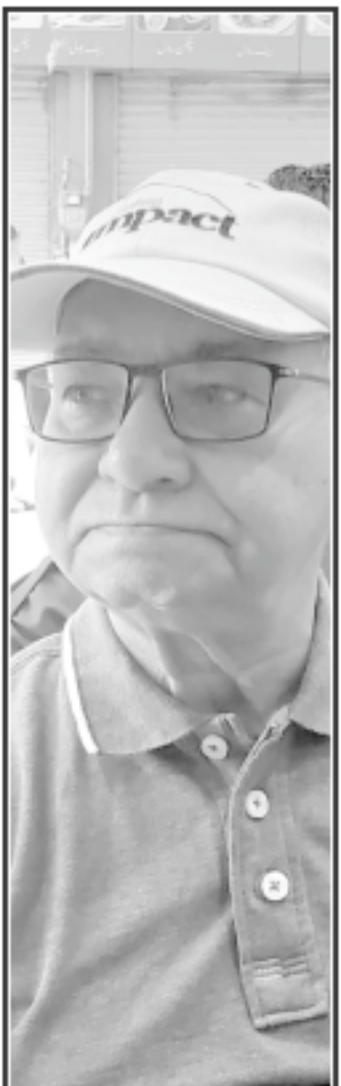

اجمل اعجاز

بادل کے بھی ساتھ چلے
پانی پر بھی چلتا چاند
جب سے تجھ کو دیکھا ہے
آئینے سے جلتا چاند

لطف آیا تھا اس سے ملنے میں
شام اک شام تھی جوانی کی
خیرمقدم کیا تھا نظروں نے
مسکراہٹ نے میزبانی کی

چشم خوابیدہ کے دریچے کھول
شام ڈھل جائے رات ہو جائے
آنکھ سے آنکھ بس ملے اجمل
اور بن بولے بات ہو جائے

ہوئے گل بات کی طرح پھیلی
زلف اک رات کی طرح پھیلی
اس کی آمد کی اک خبر تھی جو
چاندنی رات کی طرح پھیلی

رباعیات

مہنگے در و دیوار نہ زینہ دیکھیں
سادہ سی رہائش کا قرینہ دیکھیں
سرکار کا حجرہ ہے ابھی تک موجود
محلوں کے مکیں جا کے مدینہ دیکھیں

کم کم ہی مودت کا شرف ہوتا ہے
اکثر کا دماغ اور طرف ہوتا ہے
دیکھا نہیں عرفان علی ہو سب میں
ہر سنگ کہاں دُرِ نجف ہوتا ہے

اللہ کے ہی اسم سے آغاز کریں
اکرام و عنایات کا درباز کریں
وہ ذات ازل سے ہے جو رحمان و کریم
اس کے ہی کرم سے سخن اعجاز کریں

آفت میں سلامتی کا زینہ ہے کہا
مشکل سے نمٹنے کا قرینہ ہے کہاں
سمجھے گا تجھے نوح زمانہ سارا
طوفاں میں بتا دے کہ سفینہ ہے کہاں

وابستہ اسی فیض کے در سے رکھنا
محفوظ ندامت کے خطر سے رکھنا
یارب ہو ضروری بھی اگر حشر و حساب
پوشیدہ محمد کی نظر سے رکھنا

کہہ دو دل و جان سے کہ احد ہے اللہ
ہرگز نہیں محتاج صمد ہے اللہ
دیکھیں ذرا سکی عہدیت کا ثبوت
والد ہے کسی کا نہ ولد ہے اللہ

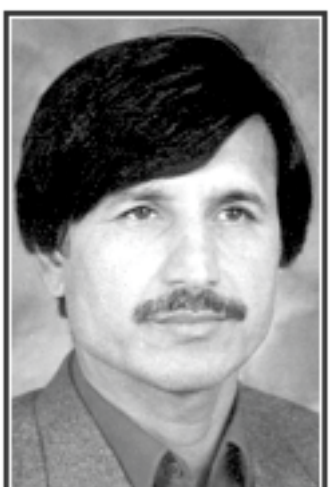

گلزار بخاری

رباعیات

بادل کو اٹھاتی ہے ہوا کی طاقت
کشتی کو چلاتی ہے ہوا کی طاقت
اکثر مرے بے وقت جنوں کی خاطر
صحرا کو اڑاتی ہے ہوا کی طاقت

.....

بازار کے آداب سے ناواقف ہیں
آفتاب کے اسباب سے ناواقف ہیں
رہتے ہیں پہاڑوں کی بلندی پر ہم
اس واسطے سیلاب سے ناواقف ہیں

.....

لوگوں کی خرافات پہ پردہ ڈالیں
بگڑے ہوئے حالات پہ پردہ ڈالیں
سب خیر منائیں ابھی اپنی اپنی
لوگوں کے حسابات پہ پردہ ڈالیں

.....

اک نظم اُٹھائی ہے غزالہ کے لیے
غزلوں کی گواہی ہے غزالہ کے لیے
چپ چاپ میں پتھر کی طرح بیٹھا تھا
اب ایک رباعی ہے غزالہ کے لیے

.....

ملنا ہے بچھڑنا ہے کہ میلہ سمجھو
تعجیل میں بندہ ہے کہ میلہ سمجھو
پابند نہیں ہوں میں کسی سمت کا بھی
پھیلی ہوئی دنیا ہے کہ میلہ سمجھو

.....

خشکی ہے نہ سبزہ ہے اکیلا بندہ
صحرا نہ دریا ہے اکیلا بندہ
ہو گھر میں کہ باہر کسی میلے میں ہو
زندہ ہے نہ مردہ ہے اکیلا بندہ

.....

موجوں کی روانی کا ارادہ سمجھو
بہتے ہوئے پانی کا ارادہ سمجھو
کردار تو آتے ہیں چلے جاتے ہیں
اس بار کہانی کا ارادہ سمجھو

.....

سعید اشعر

رباعیات

دریافت ہوں گے نئے خزانے مجھ سے
اترے گا خدا ہاتھ ملانے مجھ سے
میں نوعِ بشر کی لکھ رہا ہوں قسمت
پوچھیں گے راستہ زمانے مجھ سے

ڈر سے نہ ڈروں تو بے بسی آتی ہے
ڈرنے سے کہاں داد رسی آتی ہے
میں کیسے کروں اپنے سر سے آگے کا سفر
مرتا ہوں تو موت کو ہنسی آتی ہے

بے سایہ ہوا ہے سائباں میں ڈھل کر
حیران ہے منظر آسماں میں ڈھل کر
آئینے کو لپکا ہے صورت گری کا
سو نقش بنیں رنگِ گماں میں ڈھل کر

رقصاں ہو گئے نقش نمایاں ہوکر
آئینہ گریزاں ہو حیران ہوکر
عریاں ہوتا گیا نہاں ہوتا گیا
مشکل ہو گیا وہ شخص آساں ہو کر

خاموش صدا سے گیت گاؤں گا میں
سر پر مگر آسماں اٹھاؤں گا میں
مشرق سے ہو گا نئے فردا کا طلوع
بندوق کو بانسری بناؤں گا میں

جذبات کی برسات نئی ہوتی ہے
تصویرِ خیالات نئی ہوتی ہے
الفاظ نیا رنگ پہن لیتے ہیں
تخلیق میں ہر بات نئی ہوتی ہے

ضو پیرہنِ اسم پہن لیتی ہے
سورج کی کوئی قسم پہن لیتی ہے
تھک جائے نہ عشق رقص کرتے کرتے
وہ لڑکی نیا جسم پہن لیتی ہے

نظارے کی نظر میں منظر میں ہوا
ظاہر میں ہوا پردۂ مظہر میں ہوا
سورج مجھے دیکھے اس میں یہ تاب کہاں
زندہ اپنے حسن پہ مر کر میں ہوا

محمد نصیر زندہ

ہائیکو

تیرگی سے چراغ روشن کر
دُور مکّہ بھی ہے ، مدینہ بھی
لبِ صحرا ، اُجاغ روشن کر

شام کا زرد زرد منظر ہو
کوسے کوسے لبوں سے بھاپ اُڑے
اور کمرے کا سرد منظر ہو

شام کی دُھند میں دھری کافی
اُس کے ہونٹوں کی منتظر نہ رہے
سُرخ مگ میں بھری بھری کافی

ایک تاریک سرد کمرے میں
یاد کی اُڑ رہی ہے خاک ابھی
رقص کرتی ہے گرد کمرے میں

اُڑ رہا ہے غبار سینے سے
زندگی یوں بھی کچھ اُداس ہوئی
دُور وہ بھی ہے کچھ مہینے سے

رہ میں سُورج مُکھی کا پھول ملا
اِسے قسمت کہیں گے یا سازش
جو بھی رہبر مِلا ، فضول مِلا

یہ ہے خواہش کِسی کا درد مِلے
ہجرِ جاناں میں سسکیاں بھر لیں
اور موسم بھی سرد سرد ملے

بچ نہ پائے گا دل چڑیلوں سے
پاس اُن کے جدید تر ہتھیار
وار کرتے ہیں ہم غلیلوں سے

اُس کے گالوں کو تتلیاں چُومیں
شہد ٹپکے ہے اُس کے ہونٹوں سے
اہلِ دل اُس کے گرد ہی گھومیں

اُس کی باتیں ہیں شاعری گویا
رس ہی ٹپکائیں اُس کے شیریں لب
اُسے آتی ہے ساحری گویا

خشک تالاب میں کنول گویا
لب کُشا ہو تو پھُول جھڑتے ہیں
اُس کی باتیں بھی ہیں غزل گویا

یہ سبھی کچھ تو ہیچ ہے گویا
یُوں لگے اُس کی اس بناوٹ سے
حُسن بھی داؤ پیچ ہے گویا

پھر سبھی ہونٹ زرد پڑنے لگے
ایسی شِدّت بھری غضب رُت میں
سب کے جذبات سرد پڑنے لگے

وہ نہیں مِل سکا اڑوس پڑوس
دل نے ہر جا اُسے تلاش کیا
دُور منزل ہے اور کتنے کوس

خوشبوئیں آ رہی ہیں صندل کی
عام انسان تُو اُسے نہ سمجھ
وہ پَری ہے سفید جنگل کی

دل کے اندر اُسے تلاشا تھا
جِس نے مجھ پر اُچھالے ہیں پتّھر
میرے ہاتھوں نے خود تراشا تھا

آفتاب خان

خالد احمد: ایک ثروت مند نعت

جمیل احمد عدیل

خالد احمد واقعتاً آج بھی ایک بابرکت شاعر ہیں کہ سچے نعت کے لیے ماضی کا صیغہ کسی نوع کی مناسبت نہیں رکھتا۔ انھوں نے عشق رسالتمآبؐ سے اپنے قلب کو زندہ کیا، قدرت نے ثنا خواں ہونے کی نسبت سے ان کے نام و دوام کے انعام سے سرفراز کر کے سرمدی نقش میں تبدیل کر دیا۔ ممدوح کی تقدیر میں امر رہنا لکھ دیا جائے تو مداح اور مدحت کا 'اپنے آپ' بقا سے رشتہ استوار ہو جاتا ہے۔ وصاف رسولؐ ہونا ایک اعزاز ٹھہرا اور خالد احمد کا امتیاز یہ ہے کہ انھیں اپنے منصب کی عظمت کا غایت درجہ احساس و ادراک ہے اسی لیے وہ اظہار

عقیدت کے محدود منطقے میں مقید نہیں رہتے بل کہ حضورؐ کی عظیم شخصیت سے وابستہ اُن تمام حوالوں کو موضوع سخن بناتے ہیں جو حیات کی جملہ جہتوں سے اسی طرح منسلک ہیں جیسے آفتاب سے حرارت اور ضو جڑی ہوئی ہے۔ غالب نے جانے کس کیفیت میں کہہ ڈالا تھا:

جز سخن کفرے و ایمانے کجاست
خود سخن ز کفر و ایماں می رود!

.....

یعنی: 'کفر اور ایماں باتوں کے سوا کہاں ہیں' اور باتیں بھی کفر و ایماں کے لیے، انھیں غلط یا ثابت کرنے کے لیے کی جاتی ہیں۔

لیکن بقول ایک مفکر: ''ایمان اور کفر محض اعتقادی چیزیں نہیں، جو انسان کے ذہن تک محدود ہوں۔ ان کا تعلق زندگی کے نظری اور عملی دونوں مسائل سے ہے۔''

خالد احمد کی ''تشبیب'' کا مطالعہ اس اعتبار سے نعمت ثابت ہوا کہ شعریت کی اعلا جمالیات، تہذیب لفظ کی خاص کو ملتا اور تلازمہ کاری کی بہترین نفاست کو کہیں معمولی سی زک بھی نہیں پہنچی اور ہر شعر زیست کی صداقت سے گہرا انسلاک اور پختہ ناتا رکھتا ہے بلاشبہ یہ بڑا ہی نازک مقام ہے، تخلیق کار کو یہ شعور بھی بے تاب کرے کہیں اس کا والہانہ لگاؤ، تجاوز کو چھوتا ہوا ادب کے عمدہ معیارات سے فاصلہ نہ اختیار کر لے! یوں بھی نہ ہو کہ سخن وری کی پرستش میں شمائل محبوب اور اس کے افکار ثانویت کے مدار میں اسیر ہو کر رہ جائیں! اس تناظر میں حضرت حسانؓ بن ثابت پر علامہ اصمعیؒ نے اپنی طرف سے 'معروضی تبصرہ' کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا:

شعر حسان فی الجاہلیۃ من اجود الشعر فقطع متنہ الاسلام!

.....

''حضرت حسانؓ کے جاہلی اشعار نہایت عمدہ ہیں، اسلام نے اس کی کمر توڑ دی۔''

مگر جناب ارشاد شاکر اعوان کے اس محاکمے میں حکمت کی فراوانی دیکھیے:

رسالتؐ کے شعرا کو اس سے بڑھ کر کوئی کیا خراج پیش کرتا؟ معیار کا یہی 'گرنا' تو اس شاعری کو وہ بلند معیار عطا کرتا ہے جو ادب اسلامی کا بنیادی نظریہ تھا۔''(۱)

صاحبو! کہنا بس یہ ہے کہ عام نظریات کی پیش کش ہی معیار فن کو برقرار رکھنے کے لیے کچھ کم آزمائش کا سبب نہیں ہوتی۔ دینی تصورات اور مقدس شخصیات کے تذکار تو اور بھی پُل صراط ثابت ہوتے ہیں اسی لیے پیور لٹریچر کا دامن زیادہ امثلہ سے مزین نہیں ہے۔ خالد احمد کے نعتیہ قصائد کا مجموعہ ''تشبیب'' شاعری کا دل آویز نمونہ ہے اور یہ رعنائی کسی اتفاق کا صلہ نہیں بل کہ شاعر کے تربیت یافتہ شعور کا ارمغان ہے۔ انھیں خوب معلوم ہے حضورؐ مطلق صداقت کا

عنوان ہیں، اضافیت اس مقام پر محدودیت کی ترجمان ثابت ہوگی۔ آپؐ کی پاکیزہ ذات بے شک بے حد ارفع ہے۔ یوں خالق کائنات، وحی، سیرت اور قرآن فطرت کے تسلسل کو جس منزہ وجود میں انھوں نے مرکوز محسوس کیا، وہ عمل کسی لمحاتی داخلی جذبے کا ثمر نہیں تھا بل کہ معروضیات کے پیمانوں پر پورا اترتا تھا۔ اس طرح مجرد تخلیہ منہا ہوتی چلی گئی اور ارضی حقائق آسمانی حقائق سے آمیخت ہو کر ان پر منکشف ہوتے چلے گئے۔ خالد احمد کے نعتیہ اظہارات اسی سنگم کے پیش کنندہ ہیں۔

اس پس منظر میں خالد احمد کا نعتیہ کلام متداول رسمیات سے یکسر مختلف ذوق اور ذائقے کا ترجمان قرار پائے گا۔ آپؐ کے نام میں اسم دوام کا پنہاں ہونا ختم نبوت کا اشاریہ ہے کہ قیامت تک کے لیے ہر نوع کی قدیم و جدید ضرورت رسالت کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ یعنی اوراق قرآن سے باہر رہنما اصولوں کی تلاش اب لاحاصلی پر منتج ہوگی۔ بدیہی امر ہے جسے نو امیسِ الٰہیہ کا عرفان حاصل ہے وہی آپؐ اور آپؐ کے پیغام کی سرمدیت کو ان اشعار کے قالب میں ڈھال سکتا ہے:

اے راز ابجد
قفل زمان و مکان
اے ازلوں کے نور
اے انتوں کی جان
تیرے نور سے ہیں
روشن سات زمان
اے راز ابجد
اے اسم امکان

.....

آپؐ محیط ہفت زمان
آپؐ ہیں مرکز ہشت جہات
آپؐ خطیب رسولوں کے
قاموس جامع کلمات
آپؐ خدا کا خزانہ ہیں
آپؐ ہیں مخزن انعامات
آپؐ ضمیر آدم ہیں
آپؐ اذان تفصیلات
آپؐ ہیں تنویر اکوان
آپؐ ہیں کون تنویرات
نور ازل ، عقل اول
آپؐ اصول تشکیلات
آپؐ نبوت کا اتمام
آپؐ امامت کا اثبات

.....

حسن بیان کا معجزہ ارتفاع تفکر سے کچھ کم تر نہیں ہے۔ آیات قرآنی کا نصف اعجاز لاریب اس کے اسلوب سے منسوب ہے۔ اگر دانائی مرموز معارف تک رسائل نہیں بھی حاصل کر پائی تو سخن فہم طرز نگارش کے طلسم پر دم بخود ہوئے بنا نہیں رہ سکا۔ تقدیسی ادب میں حرف کے ترفع سے تہی،

سپاٹ بیانیے کی شناخت سے جُڑی کسی تحریر کا حوالہ تو دیجیے جو محض اپنی فکری توانائی کے کارن اجتماعی حافظے کا حصہ بننے میں بامراد ٹھہری ہو؟ بحیثیت مجموعی بھی دیکھا جائے تو حسن شناسی (Aestheticism) کے بغیر آرٹ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور لفظ سے بڑھ کر آرٹ کا حسین مظہر آنکھ نے ہنوز دیکھا نہیں۔ تصویر لفظ کے مقابل فروتر ہے کہ اسے سنا نہیں جا سکتا، بولا نہیں جا سکتا۔ یہ لفظ ہے جسے دیکھا، سنا، بولا پڑھا اور لکھا جا سکتا ہے۔ الہامی کتب کی بنیاد تعلیم تو کسی ارتقا سے دوچار نہیں ہوئی۔ وقت کی گزران نے زبان کو تعمیر کیا ہے یا بدلتے ماحول کی مناسبت سے احکام کو مرمم صورت سے ہمکنار کیا ہے۔ وگرنہ اصول شروع سے مستحکم شکل میں موجود رہے ہیں۔

ایک صاحب بصیرت کہتے ہیں:

''جس نے نئے لفظ سے پہلی نظر میں پیار نہیں کیا، اس نے ابھی پڑھنا نہیں سیکھا۔''

''تشبیب'' ان چند شعری کتابوں میں سے ایک ہے، جو قاری کو نئے لفظوں سے محبت کرنے پر آمادہ کرتی ہے گویا اسے پڑھنا سکھاتی ہے، جہاں معانی کی جدید جہتوں سے تعلق استوار کرنے پر اُکساتی ہے۔ طرفہ نکتہ اس میں یہ پوشیدہ ہے کہ پڑھنے والا لغت ہائے حجازی کا، قارون ہونے میں ترغیب محسوس کرنے کے بجائے مختلف الفاظ اور نادر تراکیب کو ذکر محبوبؐ کی نامیات سے نسبتیں قائم کر کے وصول و قبول کرتا ہے۔ اس تجربے کی لطافت سے کیسے انکار کیا جائے کہ ان قصائد کی قرأت کے دوران ایک بھی اجنبی لفظ ابلاغ کی راہ میں مزاحم نہیں ہوتا: جیسے خوب صورت چہرہ اپنا تعارف خود ہوتا ہے: نام دریافت کرنے کا مرحلہ تو بعد کا ہے: پھر اس نام کا معنی فرنگ میں سے ڈھونڈنا: اس کے بھی بعد کا...... دِل پہ ہاتھ رکھ کر کہیے: جسے چاہا جائے، اس کے اپنے نام کا مطلب یا اُس کی زبان سے ادا ہونے والے لفظوں سے مفاہیم کی جستو کے دوران ایک آن کے لیے بھی وہ محسوس دھیان سے اوجھل ہو پاتا ہے؟ ہرگز نہیں! چنانچہ ''تشبیب'' کے تخلیقی بہاؤ، عملِ تعشق، شعری غنائیت، نورِ شعور اور اسرار و غوامض سے مرتب منظرنامے میں ہر لفظ اپنا سیاق و سباق واضح کرتا چلا جاتا ہے لیکن تجسّس علم دوستی کی طرف راغب کر کے اس جادے پر گامزن کر دیتا ہے، اے جوئیند! دیکھو تو سہی لغات میں:

رودنبرات، بادِ نوال، تختِ حصیر، تاج ادام، لاملفوف، عین الاعیان، نور اکوان، الحان الاحان، عُلُوسخن، عام الحزن، ماہِ حرمان، رشحات، نفحات، مخطورات، ساجات، نبرات، مسکوکات، ممدودات، رعدِ میقات، قطار قضات، نظرات، تبشیرات، نہارِ استشفاعات، مسلوبات، محافظِ تودیات،

صورت تعدیل ثرات، فرعیات، سمت الراس، تصدیعات، کرات ومرات، استہلال، حمال، ایمائے تعال، بتخال، ابلق لیل نعال، میکنال، اعیان طلال، تاج تعال، مہال، بیتا، سخن کارواں.....

کے معانی کیا ہیں؟ مترادفات کی صورتیں کیا ہیں؟ کس زبان سے ان کا رشتہ ہے؟ ان کی گرامر کیا ہے؟.....؟

ان سوالات کے جوابات کا حصول اور ہی طرح کی مسرت و بہجت سے ہم کنار کر دینے والا ہے۔ ہاں! ''تشبیب'' کے صفحات سے صرف ذہنی افق ہی نہیں پھیلے گا، محض Vocabulary ہی میں اضافہ نہیں ہوگا بل کہ شاعر کے لیے بے ساختہ جذبات تحسین پیدا ہوں گے کہ Virteous لفظوں کے برمحل استعمال سے یہ زیرک تخلیق کار خوب آگاہ ہے۔ مزید برآں یہ فہم بھی رکھتا ہے کہ کون سا موتی بادشاہ کو پیش کیے جانے کے لائق ہے! لذت جاتی رہے گی وگرنہ غرض کرتے کہ شاعر نے اُن اسالیب سے ہم آہنگ کر دیا ہے، جو آداب حاضری سے بھی واقف کر دینے والے ہیں۔ آخر دقیق رنگین عبارت کا بھی کوئی موقع، کوئی مقام ہوا کرتا ہے۔

انسان نے انتخاب کی آزادی (Freedom of choice) سے غالباً کچھ زیادہ ہی فائدہ اٹھا لیا ہے۔ بہر طور صدیوں کے تجربات نے یہ آموختہ اسے اچھی طرح ذہن نشین کرا دیا ہے کہ راستی پر قائم رہنے کے لیے نتائج سے بڑی حقیقت اور کوئی نہیں۔ اسے سامنے رکھنے کی معنویت لاریب پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی۔ اس سیاق میں نتیجہ وہ واحد Incentive ٹھہرے گا جو فرد کو مفید، بہتر، عمدہ، اچھا کرنے کی طرف مائل رکھتا ہے۔ ہاں! اسے تلخ حقیت کہیے کہ اس کے باوجود بُرا کرنے سے باز نہیں آتا۔ کیوں؟ کیا نتیجے کا عمل یہاں غیر مؤثر ہو جاتا ہے؟ غیر مؤثر تو نہیں ہوتا مگر اتنا مؤثر بھی نہیں رہتا، جس قدر Virtue کے حوالے سے تیر بہدف (Effective) ثابت ہوتا ہے اس لیے کہ انسان طبعاً 'خوگر پیکر محسوس' ہے۔ منفعت کی Soild State اسے اچھائی پر لگائے رکھنے کے لیے کافی ہے۔ اسی لیے نیکی کرنا بس ایک کار ہے، جب کہ گناہ سے بچنا، کارنامہ ہے۔ گناہ کی Magnetization سے بڑا جادو اب تک ایجاد نہیں ہو سکتا۔ یہاں کس سرعت سے نتائج محجوب ہوتے چلے جاتے ہیں، بیان سے باہر یہ جانیے! صرف ایک چیز ہے جو انسان کو گناہ (Sin) سے دور رکھ سکتی ہے اور وہ ہے کسی شخصیت کا اثر، بس اس سے وابستہ شرم مانع ہو جائے تو قدم رک جاتے ہیں ورنہ فوراً پٹ جاتے ہیں۔ نعت دراصل عہد نامہ ہے، ایک امتی کا اپنے

رسولؐ سے اس کا اعادہ، کومٹ منٹ کو ایسی پختگی عطا کر دیتا ہے کہ پھر گناہ کی قوت جاذبہ، کشش سے دستکش ہونے لگتی ہے۔

''تشبیب'' سے منسوب اسی بلاتمہید گریز مدحیہ قصیدے میں وہ جان ڈال دی ہے کہ شاعر کے لیے معاً دُعا نکلتی ہے کہ اس کی طلب پہ مطلوب کو پیار آ جائے!

علاوہ ازیں اسے بھی ''تشبیب'' کا فیضان سمجھیے کہ معلوم ہوا ہے فرد کی تفرید، تجرید سے براہ راست اُنس کا رشتہ جوڑنے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتی۔ طبعاً نوع اپنی نوع سے ہی لگاؤ رکھ سکتی ہے۔ بے شک ''تشبیب'' کے بعض اجزا بلاواسطہ حمدیہ ہیں لیکن جو ''وجود'' انسانی حواس کے آنگن میں اُتر ہی نہ سکے، اس کی 'حمد' کیسے ممکن ہو گی؟ جب خود محمود نے ظہور آدم خاکی کے ذریعے تعارف کا Channel ترتیب دیا ہے تو ہم کون ہوتے ہیں، سرحدِ ادراک سے پرے اپنا مسجود بنانے والے؟ ہماری تقدیر، لباس مجاز ہے۔ سو، خالد احمد کی نعتیہ شاعری نے ایک ایسی حقیقی، سچی، موجود شخصیت سے قاری کو عقیدت اور محبت کے دھاگے میں پرو دیا ہے، جن کی سرفرازی کا زمزمہ وہ یوں گنگناتے ہیں:

تیرے جگراتے
صبحوں کے نگران
تیرا صدق نماز
تیرا خلق اذان
تیرے بول حدیث
تیری چپ قرآن
حق تیرا کردار
حق تیرا عنوان
تیری چھاؤں رہے
مجھ پر دھوپ سمان

.....

آپؐ ہیں وجہ موجودات
کاف ''کُن'' ہے آپؐ کی ذات
آپؐ ہیں شمشیر توحید
حمد کا پرچم آپ کے ہاتھ
اک کلمے کی ''مزدوری!''
روزہ، حج، نماز، زکوٰۃ
کوئی تضاد نہیں جن میں
آپؐ پہ اُتریں وہ آیات
کعبے کی چھت پر ہیں بلالؓ
یہ ہیں انساں کے درجات

.....

تو ''تشبیب'' کا قاری، ان کی ہم نوائی میں محض قاری نہیں رہتا، خالد احمد ہو کر پکار اُٹھتا ہے:

''تو نے پاتال کی قسمت میں بھی رفعت لکھی!''

حواشی:

1- عہد رسالتؐ میں نعت، ص:69

☆☆☆☆☆

خالد احمد سے جُڑی یادیں

خالد احمد کا ایک شعر ہے:

زندگی میں کسی رُخ کا کسی دُکھ کا ہونا
اچھا ہوتا ہے سفر میں کوئی اپنا ہونا

.....

اور پھر 2013 کے مارچ میں شہر لاہور، ملک پاکستان اور دنیا بھر میں آباد بہت سوں کے اپنے خالد احمد ہم سب سے ہمیشہ کے لیے جُدا ہو گئے۔ مجھے یاد ہے بہت اچھی طرح ان کے نحیف بدن پر چمکتی آنکھوں کی مدھم روشنی کس طرح، ہر آنے والے کو جی آیاں کہہ رہی تھی، قذافی سٹیڈیم کے آرٹس کونسل کے نیم تاریک، نیم روشن ہال میں ان کے شعری مجموعہ ''نم گرفتہ'' کی تقریب رونمائی تھی، ان کی ہنستی مسکراتی آنکھوں نے جن لوگوں کو خوش آمدید کہا، ان میں ایک میں بھی تھا۔ تبھی نہ جانے اچانک کیوں میرے من میں ان سے الحمرا، مال روڈ کی ادبی بیٹھک میں اس ملاقات اور گفتگو کا احوال ایک فلم کی ریل کی طرح میری آنکھوں کے پردے پر روشن ہو گیا۔ جب میں اپنی والدہ کی بیماری سے متعلق انھیں بتا رہا تھا اور ان باتوں کے بارے میں پوچھ رہا تھا جو انھیں اس مرض سے شفایاب کرے یا کم از کم درد کی انتہا میں اُن کے لیے راحت اور سکون کا باعث ہو۔ کہ خالد احمد جنھیں میں اپنا ایک شفیق بھائی، اپنا استاد اور ان کی زندگی میں بھی اور آج تک اردو کے اہم ترین شعرا اور انتہائی پڑھے لکھے دانشور کا درجہ دیتا تھا اور آج بھی کہتا ہوں، کہ جیسی دسترس اور جو ہنر شاعری کا خالد احمد کے پاس تھا۔ اس عہد کے کسی دوسرے شاعر کے پاس شاید ہی ہو، وہ اپنی ذاتی محفلوں میں چہکتا تھا، طنز کرتا تھا، تو ایک سطح پر رہ کر اور اگر علمی گفتگو کرتا تھا، تو ہم جیسے نواردانِ محبت اس کے علم کے موتی چُنتے تھے، اور بے تکلفی ایسی کہ چاہے آپ اپنی محبوبہ کے راز میں اُسے شریک کر لیں اور چاہیں تو پنجابی صوفی شعراء کی اس واردات قلبی پر بات

زاہد حسن

کرلیں، جس کا اظہار وہ اپنی شاعری میں کرتے ہیں۔ مجھے ان سے محبت اور عقیدت کے اس رشتہ پر اس لیے بھی فخر ہے کہ وہ لاہور میں اور پنجاب میں رہتے ہوئے ہم پنجابیوں ہی کی طرح پنجابی بن گئے تھے اور ان کی شاہ حسین (مادھولعل حسین) پر لکھی نظم اتنی بے مثال ہے کہ میں نے ان سے یہ نظم کئی بار سُنی، سُناتے سے پہلے وہ کچھ لمحے بھر کو خاموش ہو جاتے اور پھر آنکھیں بند کیے، اس کو ترنم اور لے میں ترتیب دیتے اور پھر ڈوب کر اتنی لگن کے ساتھ سُناتے کہ وہ خود بھی اور سُننے والے بھی گویا جہانِ دیگر کی سیر کر رہے ہوتے، اور آج وہ سارا ماضی، ماضی کی ساری یادیں خود خالد احمد کے اپنے لفظوں میں کچھ یوں دکھائی دیتی ہے:

ہر سخن تھا ہم اہلِ غم کے لیے
دل شکن، دل خراش، دل آزار

.....

ابھی تازہ تازہ اُن کی ایک غزل کا مطالعہ کر کے بیٹھا تو وہ سارا عہد اس زمانے کی ساری محفلیں ایک ایک کر کے آنکھوں سے گزر گئی ہیں، تاریخیں تو پوری طرح یاد نہیں، تاہم یہ پچھلی صدی کی نوے کی دہائی کے شروع کا زمانہ تھا شاید، ان کا مجموعہ ''دراز پلکوں کے سائے سائے'' اور شاید کچھ ہی عرصہ میں ''پہلی صدا پرندے کی'' چھپ کر سامنے آیا تھا، احمد ندیم قاسمی صاحب ''فنون'' کا دفتر میو ہسپتال کے قریب سے لوئر مال پر لے جا چکے تھے، طاہر اسلم گورا نے بھی لوئر مال پر اشاعت گھر قائم کرلیا تھا، ''فنون'' کے ساتھ ساتھ شعرا و ادبا اس اشاعت گھر پر بھی محفلیں جمانے لگے تھے، لیکن اس کے کچھ عرصہ ہی بعد خالد احمد، نجیب احمد، محمد عالم خاں اور اسلم طارق کے ساتھ چائنیز لنچ ہوم کے سامنے کہ جہاں اب کتابوں کا بازار جمتا ہے وہاں بیٹھنے لگے، جہاں کبھی کبھار علی اصغر عباس، عارف محمود، جاوید انور، اور بعض دیگر احباب کے ساتھ میں بھی بیٹھک ہوتی۔ میں 1985 تک لاہور آچکا تھا۔ اور شعر و ادب سے ازحد لگاؤ کے سبب اردو اور پنجابی حلقوں میں باقاعدہ آنے جانے، شاید عام لفظ ہے، بلکہ گھس چکا تھا، اور پاک ٹی ہاؤس، چائنیز لنچ ہوم، پاکستان نیشنل سنٹر، شیزان اور دیگر جگہوں پر ہونے والی ادبی تقریبات میں بہت باقاعدگی کے ساتھ شریک ہوتا تھا۔ تاہم اِس بات کی مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی، کہ ''حلقہ ارباب غالب، لاہور جس کی محفلیں دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری میں باقاعدہ کے ساتھ ہوا کرتیں تھیں اور خالد احمد جس کے اہم منتظمین اور حاضرین میں سے ایک ہوتے تھے، میں کبھی اس میں کیوں شریک نہ ہو پایا۔ لیکن انارکلی میں ان کی محفلوں میں کہ جہاں بعض لاہور کے اور بعض اوقات بیرون لاہور کے اہم احباب شریک ہوتے تھے، خالد احمد کی اس محفل میں اُن سے ملنے اور باتیں سننے کا شرف حاصل رہا کہ جہاں مجھ سمیت کئی اور نئے لکھنے والوں کے جانے کا واحد مقصد ہی یہ

تھا کہ خالد احمد کی باتیں سنیں، اُن سے ان کی نئی شاعری سُنتے ہوئے یہ بھی سیکھیں کہ شعر نہ صرف یہ کہ کہنے کا رنگ ڈھنگ کیا ہونا چاہیے بل کہ پڑھے ہوئے اُس میں تلفظ اور اُس کی ادائیگی کس طرح کرنا چاہیے، وہ انارکلی کی بیٹھکیں ہوں، لکشمی چوک میں الفضل ہوٹل کی، الحمرا میں ادبی بیٹھک کی، یا پھر پاک ٹی ہاؤس میں حلقہ ارباب ذوق کی، حلقہ ارباب ذوق، لاہور کے سالانہ الیکشن کی گرمجوشی ہو، یا پھر ''فنون'' کے میاں چیمبرز والے دفتر میں سینئرز کی علمی و ادبی گفتگو، خالد احمد، کو ہمیشہ نمایاں حیثیت حاصل رہی اور ان کی یہ حیثیت ان کے شعری قد و قامت اور علمی و فکری مرتبے کے سبب تھی، کہ ان کے علم اور فکر کی 'کڑی لاہور میں موجود اس نسل سے جُڑی تھی، جن کے ناموں کی کہکشاں لاہور کی ادبی، تہذیبی، فکری اور ثقافتی زندگی میں آج بھی روشن باب کا استعارہ تھا، لیکن پھر جب اس شعر کے کھلے معانی کی صورت:

ہر سانس ہوا کا ساتھ رہا، ہاتھوں میں ہوا کا ہاتھ رہا
جب ہاتھ ہوا نے کھینچ لیا، آوارۂ صحرا بیٹھ رہے

.....

تو کیا کچھ نہیں بیٹھ گیا!
لکشمی چوک کا الفضل ریسٹورنٹ اور نسبت روڈ، جہاں اُن کی رہائش تھی، اور جہاں کئی بار جانے کا اتفاق ہوا اُن سے چائے پی گئی اور جہاں حلقہ ارباب غالب کے پروگرامز ہوتے رہے، جب وہیں سے ماہنامہ ''بیاض'' کا آغاز ہوا، تو لاہور کی 'ادبی زندگی میں ہی یہ ایک نئے واقعہ ایک نئے باب کا آغاز نہ تھا بل کہ خالد احمد کی زندگی کی بھی ایک طرح سے نئی شروعات تھی، ادب کے نئے نئے گلستان میں کھلے سرو صنوبر پر اس قدآور درخت کی شاخوں، اس کی چھاؤں میں طیورِ نودارداں کے پرّے کے پرّے مختلف آشیانوں سے اُڑ اُڑ کر یہاں اپنا ٹھکانہ کرنے لگے، ایک بڑا وژن رکھنے والے فن کار کی شعری و فکری پرواز ہی بلند نہیں ہوتی، آنے والے زمانوں میں خوابیدہ زمانے بھی اس کی چشمِ پُرکشا ہوتے ہیں، آج ''بیاض'' ایک عشرت گاہ، ہے جو عمران منظور اور اس کے رفقائے کار نعمان منظور، اعجاز رضوی، جاہد احمد اور دیگر احباب کے طفیل قائم و دائم ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والوں کے لیے بہت سے راستے بند ہو رہے ہیں۔ پچھلے کچھ عرصہ کے دوران کتنے ہی رسائل و جرائد بند ہو گئے، واماندگانِ شوق نے نئی نئی پناہ گاہیں، ڈھونڈ لیں، لیکن وہ شمع جو خالد احمد نے اپنے ہاتھ سے روشن کر گئے، جل رہی ہے، جلتی رہے گی، اور کتنی ہی یادیں وابستہ ہیں، ان سے اس شمع گاہِ بزم میں ملاقاتوں اور باتوں کی۔ اور ان لوگوں کی جو کچھ تو خالد احمد کی زندگی میں اور کچھ بعد میں رونقِ جہاں چھوڑ گئے!!

یہ سفر، سر بہ سر رائیگاں بھی نہیں
کارِ دل محض کارِ زیاں بھی نہیں
خالد احمد

☆☆☆☆☆

نم گرفتہ تہذیب اور چراغ کی ضد

(خالد احمد کے شعری مجموعہ نم گرفتہ کا فکری و تہذیبی مطالعہ)

نوید صادق

خالد احمد کا شعری مجموعہ ''نم گرفتہ'' پڑھتے ہوئے پہلا احساس یہ نہیں ہوتا کہ ہم کسی شعری مجموعے کے روبرو ہیں بلکہ یہ ہوتا ہے کہ ہم کسی ایسی تہذیبی فضا میں داخل ہو گئے ہیں جہاں سب کچھ بظاہر اپنی جگہ موجود ہے، مگر اپنی اصل معنویت کے بغیر۔ شہر کھڑے ہیں، بازار روشن ہیں، زبان بولتی ہے، عبادت گاہیں آباد ہیں --- مگر ان سب کے اندر کہیں ایک ایسی نمی رچی ہوئی ہے جو چیزوں کو فوراً منہدم نہیں کرتی-- آہستہ آہستہ کھوکھلا کر دیتی ہے۔

قاری چند صفحات کے بعد خود سے پوچھتا ہے:

''یہ بوجھل پن کہاں سے آ رہا ہے؟''
اور شاعر جیسے دھیرے سے جواب دیتا ہے:
''یہ تمہارے عہد کی سانس ہے--- نم آلود، مگر مسلسل۔''

یہی وہ مقام ہے جہاں ''نم گرفتہ'' محض داخلی کرب کی شاعری نہیں رہتی - - - تہذیب کی اس سطح کو چھوتی ہے جہاں عادت خود معنی پر غالب آ جاتی ہے۔ یہاں بحران کسی بڑے سانحے کی صورت میں نہیں آتا--- روزمرہ میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ ظلم آہستہ آہستہ چلن بن جاتا ہے، بے حسی معمول، اور سوال ایک اضافی شے۔ Henri Lefebvre کے بقول جدید زندگی معنی کو ایک دم ختم نہیں کرتی، وہ اسے تکرار کے ذریعے رسا دیتی ہے۔ خالد احمد اسی رساؤ کو شعر میں بدل دیتے ہیں، اور میں چونک کر محسوس کرتا ہوں کہ یہ شاعری کسی اور کے بارے میں نہیں، میری اپنی زندگی کے بارے میں ہے۔

اسی معمولیت کی پہلی ٹھوس صورت ''دیوار'' ہے۔ دیوار یہاں محض راستہ روکنے والی شے نہیں رہتی--- ایک تہذیبی نظم کی علامت بن جاتی ہے--- ایسا نظم جو سوال کو بے ترتیب، بے وقت اور خطرناک سمجھتا ہے۔ یہ دیوار صرف جسمانی حرکت کو محدود نہیں کرتی--- سوچ کی سمتیں بھی متعین کر دیتی ہے۔ یہ طے کرتی ہے کہ کیا کہا جا سکتا ہے اور کس بات پر خاموشی زیادہ محفوظ سمجھی جائے گی۔ رفتہ رفتہ یہ دیوار معنی کو بھی اپنے دائرے میں لے لیتی ہے، چیزوں کو نام دیتی ہے، حدیں کھینچتی ہے اور اختلاف کو بدنظمی کے خانے میں ڈال دیتی ہے۔ یوں دیوار ایک غیر مرئی ضابطے میں بدل جاتی ہے جو نظم کے نام پر جمود کو قائم رکھتا ہے اور زندگی کو سوال سے زیادہ اطاعت کا عادی بنا دیتا ہے:

کس لیے اِرد گرد کھینچ لیے
دائرہ دائرہ در و دیوار

آنکھ سر پھوڑتی رہی خالد!
اور منہ دیکھتی رہی دیوار

یہ کیسا تار کھینچا؟ خول کیسا بُن دیا؟
ہنر مندی نے دیوار ہنر میں چُن دیا

یہ دیوار جواب نہیں دیتی، مگر اس کا نہ بولنا ہی سب سے بڑا اور سب سے فیصلہ کن جواب بن جاتا ہے۔ اس خاموشی میں انکار بھی ہے

اور اختیار بھی--ایسا اختیار جو خود کو جواز دینے کا محتاج نہیں رہتا- Michel Foucault نے اسی لیے لکھا تھا کہ جدید سماج دیواریں محض قید کے لیے نہیں کھڑا کرتا— اطاعت کی تربیت کے لیے وضع کرتا ہے- یہاں دیوار سوال کو روکتی نہیں، اسے زخمی کرتی ہے- اسے مکمل طور پر مٹانے کے بجائے اتنا کمزور کر دیتی ہے کہ وہ خود ہی اپنے جواز پر شرمندہ ہونے لگتا ہے، جبکہ دیوار خود ہر تنقید سے محفوظ رہتی ہے- آہستہ آہستہ قاری کو یہ احساس بھی گھیر لیتا ہے کہ یہ خول صرف باہر سے مسلط نہیں کیا گیا---ہم نے اسے خود بھی اوڑھا ہے— سہولت کے نام پر، نظم کے وعدے پر، اور کامیابی کے فریب میں- اور دیوار محض ایک ساخت نہیں رہتی --- ایک داخلی عادت بن جاتی ہے، جس میں آدمی محفوظ تو محسوس کرتا ہے، مگر آزاد نہیں رہتا:

ہم اُس گلی سے گزرتے ہیں سرسری خالد
اٹھا کے سر، در و دیوار دیکھ لیتے ہیں

دیواروں سے پھوڑ نہ سر
مجھ پہ بہا آنسو مجھ میں

.....

اسی خول میں انسان کی قدر سب سے پہلے تحلیل ہونا شروع ہوتی ہے- یہاں آدمی فرد نہیں رہتا بل کہ ایک قابلِ شمار شے بن جاتا ہے---ایسی شے جس کی کمی یا موجودی نظام کی روانی پر کوئی بنیادی سوال کھڑا نہیں کرتی- خالد احمد کے ہاں ''نم گرفتہ'' میں موت کسی حادثے کی طرح نہیں آتی--- وہ ایک معمول بن کر وارد ہوتی ہے، جیسے روزمرہ کا ایسا واقعہ جس پر ٹھہرنا وقت کا اسراف سمجھا جائے- شاعر کسی ایک لاش، کسی ایک چہرے یا کسی ایک صدمے پر رکنے سے گریز کرتا ہے- وہ اس سوال پر ٹھہرتا ہے جو زیادہ بے رحم ہے--- اب رُکنے کی ضرورت ہی کیوں محسوس نہیں ہوتی؟ یہی وہ لمحہ ہے جہاں بے حسی جذبات کی کمی نہیں رہتی--- ایک تہذیبی عادت میں ڈھل جاتی ہے- زندگی اور موت کے درمیان فاصلہ کم نہیں ہوتا، معنی کم ہو جاتے ہیں، اور یہی کمی اس پورے تجربے کا سب سے گہرا زیاں بن جاتی ہے:

کون گنتا جوان لاشوں کو
کون رکھتا دِلاوروں کا شمار

مُنڈیریں اُڑ گئیں، چڑیوں کا چہچہا رہ گیا
فقط گرد و غبارِ کارِ دُنیا رہ گیا

سپاہی کیا؟ سپہ سالار کیا؟ سلطان کیا؟
تہِ تیغِ اجل سامان، تینوں ایک ہیں

.....

یہ برابری انصاف کی نہیں، اخلاقی تھکن کی برابری ہے-- ایسی تھکن جو آدمی کو لڑنے سے نہیں، محسوس کرنے سے روک دیتی ہے- یہاں سب برابر اِس لیے نظر آتے ہیں کہ سب کسی نہ کسی درجے میں بے حس ہو چکے ہیں، اور یہی بے حسی نظام کے لیے سب سے موزوں حالت ہے - Zygmunt Beuman کے مطابق جدید تہذیب اخلاقی فاصلے اس لیے بڑھا دیتی ہے تاکہ ضمیر کو مداخلت کا موقع ہی نہ ملے-- آدمی دیکھتا ضرور ہے، مگر خود کو اس منظر سے الگ سمجھ کر آگے بڑھ جاتا ہے- اس فاصلے میں ظلم قابلِ برداشت ہو جاتا ہے اور ذمہ داری کسی اور کے کھاتے میں ڈال دی جاتی ہے - قاری یہاں خاموش ہو جاتا ہے، اس لیے نہیں کہ اسے سمجھ نہیں آتی، بلکہ اس لیے کہ یہ منظر اس کے لیے اجنبی نہیں رہتا- وہ پہچان لیتا ہے کہ یہ خاموشی باہر کی نہیں، اسی کے اندر کی ہے--اور یہی پہچان اس لمحے کو سب سے زیادہ بے چین کرنے والا بنا دیتی ہے:

کس خامشی کے ساتھ وہ جاں سے گزر گیا
وہ شخص دیکھنے میں کچھ ایسا غنی نہ تھا

.....

کس رُخ بھریں اُڑان، ترے آرزو گزیں
دکھلائیں طائرانِ الم، زورِ پر کہاں

.....

یہی اخلاقی تھکن شہر میں پورے قد سے سامنے آتی ہے- خالد احمد کا شہر محض پس منظر نہیں رہتا-- خود ایک تہذیبی کردار بن جاتا ہے--ایسا کردار جو براہ راست قتل نہیں کرتا، مگر قتل کے لمحے نظریں چرا لیتا ہے- یہ شہر چیختا نہیں، بس اپنی روزمرہ کی رفتار برقرار رکھتا ہے-- ٹریفک چلتی رہتی ہے، دکانیں کھلتی بند ہوتی رہتی ہیں، اور زندگی معمول کے سانچے میں ڈھل کر آگے بڑھتی رہتی ہے- اسی معمول کے تسلسل میں جرم غیر معمولی نہیں رہتا، بلکہ ایک قابلِ نظر انداز واقعہ بن جاتا ہے- شہر کی یہ خاموشی معصوم نہیں--ایک سیکھی ہوئی خاموشی ہے، جس میں خود کو بچا لینے کی حکمت بھی ہے اور ذمہ داری سے بچ نکلنے کی سہولت بھی- یوں خالد

احمد کا شہر قاتل نہیں بنتا، مگر گواہ بھی نہیں رہتا - - - اور یہی ان کی شاعری کا سب سے بے رحم تہذیبی انکشاف ہے:

پیڑوں کے مول بک گئے چڑیوں کے غول بھی
کیا ظلم ہے کہ ظلم کا چرچا نہیں رہا

.....

بھری آنکھوں، تہی داماں پھرا ہوں شہر میں
نوائے بے نوائی کی کسک تک یاد ہے

.....

چھوڑتے ہی نہیں زندانِ تعلق خالد
کچھ اسیروں کو اگر چھوڑ دیا جاتا ہے

.....

یہ شہر آدمی کو باہر نہیں نکالتا--- اندر سے خالی کر دیتا ہے --- یوں کہ جسم اور کردار باقی رہتے ہیں، مگر تہذیبی معنی آہستہ آہستہ رس جاتے ہیں۔ خالد احمد کے ہاں یہ عمل کسی جبر یا اعلان کے ساتھ نہیں آتا--- تہذیب کے اندر ایک معمول بن کر سرایت کرتا ہے۔ اسی کیفیت کو Hannah Arendt نے banality of evil کہا تھا--- ایسا شر جو تہذیبی نظم کے اندر اس طرح ضم ہو جاتا ہے کہ چیختا نہیں، بس چلتا رہتا ہے۔ قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ یہ شہر کسی ایک جگہ یا نقشے کا نام نہیں --- ہماری اجتماعی تہذیبی زندگی کا آئینہ ہے، جہاں اخلاقی فیصلے فرد سے چھن کر فضا کا حصہ بن چکے ہیں:

اے اہلِ غم! وہ سایۂ دیوار اُٹھ گیا
پہلا سا شہرِ دل کا بھی نقشہ نہیں رہا

.....

اک پل میں ایک رات کی جھلمل بکھر گئی
اے شہرِ آرزو! ترا مہمان تو گیا

.....

تنہائی سی تنہائی تھی، کرتا بھی تو کیا مَیں
سو، شہر میں صحرا کی طرح پھیل گیا مَیں

.....

اسی تہذیبی فضا میں عشق بھی داخل ہوتا ہے، مگر وہ بھی اپنی صورت بدل لیتا ہے۔ وہ اب کوئی راز نہیں رہتا جسے تہذیب سنبھال کر رکھے، نہ کوئی احتجاج بنتا ہے جو اس نظم کو چیلنج کرے--- محض منظر بن جاتا ہے--- دیکھا جانے والا، گزار دیا جانے والا۔ عشق بھی شہر کی تہذیبی عادتوں میں جذب ہو جاتا ہے --- تکرار کا حصہ بن کر اپنی مزاحمتی قوت کھو دیتا ہے۔ خالد احمد اسی لمحے کو نشان زد کرتے ہیں، جہاں احساس باقی رہتا ہے مگر تہذیب اسے بے اثر بنا دیتی ہے، اور قاری پہچان لیتا ہے کہ یہ کہانی کسی اور کی نہیں، اسی کی اپنی تہذیبی زندگی کی ہے:

کچھ چھپایا نہ ہم نے دُنیا سے
عشق ہم نے کیا بھرے بازار

....

دُنیا مجھے دیکھے، مجھے سمجھے، مجھے چاہے
اتنا تو اَب اِس سے ہے سروکار مجھے بھی

....

یار پیڑوں کی طرح ٹوٹ گئے
کوئی رویا ہے، نہ رُلایا ہے

....

عشق کاغذ کو بھی دیمک کی طرح چاٹ گیا
خاک چھانے نہ ملی، دھاک سخن دانی کی

....

یہاں عشق کسی نجاتی اِمکان کے طور پر نہیں آتا--- ایک ایسی علامت کی صورت اختیار کر لیتا ہے جو خود تہذیبی استعمال میں آ چکی ہے۔ نجی زندگی اب محفوظ دائرہ نہیں رہی، وہ قابلِ گردش تجربہ بن گئی ہے، جسے دیکھا بھی جاتا ہے اور برتا بھی۔ اصل مسئلہ اظہار کی کثرت نہیں، اُن حدوں کے مٹ جانے کا ہے جو کبھی نجی زندگی کو محفوظ رکھتی تھیں۔ اس تبدیلی میں عشق اپنی داخلی کشمکش نہیں کھوتا--- اپنی بے سمتی حاصل کرتا ہے--- وہ کسی فیصلے یا خطرے کا متقاضی نہیں رہتا--- تعلق ایک لمحاتی منظر میں بدل جاتا ہے، ایسا منظر جو یادداشت میں نہیں--- رفتار میں جگہ پاتا ہے، اور قاری کو یہ احساس دلاتا ہے کہ یہاں سوال محبت کا نہیں، اس فضا کا ہے جس میں محبت اب ممکن ہوتی ہے:

یار دِل کھول کے، خوں گھول کے روئے، لیکن
ہم نے یہ کام پسِ پردۂ اظہار کیا

عجز کچھ اور بڑھا کبر سنی کے صدقے
ہم نے ہونے سے، نہ ہونے سے بھی انکار کیا

....

نجی اور عمومی کے بیچ فاصلہ ٹوٹے تو زبان اپنی ترتیب کھو دیتی ہے۔ ''نم گرفتہ'' میں زبان محض اظہار کا وسیلہ نہیں رہتی--- تہذیب کی یادداشت کے طور پر سامنے آتی ہے--- ایسی یادداشت جس میں وقت، اخلاق اور تجربے کی پرتیں جمع ہوتی آئی ہیں۔ خالد احمد کے ہاں یہی یادداشت سب سے زیادہ نم زدہ دکھائی دیتی ہے، کیونکہ الفاظ اپنی پوری معنویت کے ساتھ ٹھہر نہیں پاتے۔ کچھ کہا جاتا ہے مگر پورا نہیں، اور جو چھپا رہتا ہے وہ بھی خاموش نہیں رہتا۔ یوں زبان نہ مکمل گواہی دے پاتی ہے نہ مکمل انکار--- وہ ایک معلق کیفیت میں رہتی ہے جہاں تہذیب اپنے ہی معنی پر بھروسا کھونے

لگتی ہے۔ میرے نزدیک یہ شکست محض لسانی نہیں --- تہذیبی ہے --- جیسے یادداشت بولنا چاہتی ہو، مگر اس کے پاس وہ فاصلہ اب باقی نہ رہا ہو جس کے بغیر بات کہنا بھی ممکن نہیں رہتا:

سبھی آنکھیں مری آنکھوں کی طرح خالی تھیں
کیا کہوں؟ کون یہاں جاننے والا تھا مرا

.....

قبا پر سلوٹیں ہیں اور تن پر جھرّیاں
سرِ کاغذ بھی غم اب کے برس کچھ اور ہے

.....

والٹر بنجمن نے کہا تھا کہ جب تجربہ ایک انسان سے دوسرے انسان تک منتقل ہونا بند ہو جائے تو کہانی مر جاتی ہے۔ نم گرفتہ کے تناظر میں یہ بات محض ادب سے متعلق نہیں رہتی --- ایک گہری تہذیبی تشخیص میں بدل جاتی ہے۔

یہاں زبان موجود ہے، الفاظ بولے جا رہے ہیں، جملے ترتیب میں ہیں، مگر ان کے پیچھے وہ زندہ تجربہ باقی نہیں رہا جو روایت کو سانس دیتا تھا۔ بات کہی جاتی ہے، مگر اس کے ساتھ جینے کا حوالہ منتقل نہیں ہوتا۔ قصہ موجود ہے، مگر اس میں وہ لمس نہیں جو اسے آگے بڑھا سکے:

یہ ماہ و سال کی دیمک کے بھُربھُرے گھر ہیں
یہ کس کا تن ہے؟ تہِ پوستیں! یہ مَیں تو نہیں

یہ گل ستانِ تصور، یہ بوستانِ خیال
کہیں یہ تُو تو نہیں ہے؟ کہیں یہ مَیں تو نہیں

.....

دَف بھی تھی نوحہ نشاں، نغمہ بھی نالہ تھا مرا
عجب آہنگِ گلوگیر حوالہ تھا مرا

.....

زرِ گل، گردِ کف پائے ہَوا کیوں ٹھہرا
یہ کہانی کسی اُجڑے ہوئے گھر سے سُنیے

قصہ آرائی کہاں، کارِ زُلیخائی کہاں
یہ روایت تو کسی آئنہ گر سے سُنیے

.....

اسی لیے یہاں تہذیب ضابطوں میں زندہ دکھائی دیتی ہے، قصوں میں نہیں۔ اصول، طریقۂ کار اور رسمی زبان برقرار ہیں، مگر وہ کہانیاں جو انسان کو انسان سے جوڑتی تھیں، آہستہ آہستہ تحلیل ہو گئی ہیں۔ روایت اب تجربے کی منتقلی نہیں --- ایک محفوظ ڈھانچے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

قاری اس مقام پر محسوس کرتا ہے کہ مسئلہ زبان کے ختم ہو جانے کا نہیں، اس ربط کے زائل ہو جانے کا ہے جو زبان کو زندگی سے جوڑتا تھا، اور یہی کیفیت نم گرفتہ کی تہذیبی اُداسی کو سب سے واضح صورت میں سامنے

لے آتی ہے۔اور--- اسی شکستہ زبان کے ساتھ دعا بھی تھک جاتی ہے:

مرے مولا! اُٹھاؤں کس طرح دستِ دُعا
کہ اب تو کہنیوں تک ہاتھ نیلے ہو گئے

.....

یہ رد دعا نہیں، تھکی ہوئی دعا ہے---ایک اجتماعی اخلاقی تھکن۔

پانی--- جو صدیوں تک زندگی، بقا اور تطہیر کا استعارہ سمجھا جاتا رہا، اپنی مانوس معنویت آہستہ آہستہ کھو دیتا ہے۔ یہ وہ عنصر نہیں رہتا جو پیاس بجھائے یا زمین کو زرخیز کرے، بلکہ ایک ایسا منظر بن جاتا ہے جو دور سے زندگی کی ممکنہ جھلک دیتا ہے اور قریب آ کر اپنی عدم موجودی کا اعلان کر دیتا ہے۔ اس تبدیلی میں محض ایک علامت کی شکست نہیں--- ایک پوری تہذیبی حساسیت کا لرز جانا شامل ہے۔ جب پانی بھی اعتماد کا سہارا نہ دے سکے تو انسان کا رشتہ فطرت سے کم اور اپنے یقین سے زیادہ ٹوٹتا ہے---اور یہی وہ لمحہ ہے جہاں پانی، جو ہمیشہ سے زندگی کا استعارہ تھا--- سراب بن جاتا ہے:

اِن سرابوں میں کہاں پانی تھا
موجۂ ریگِ رواں پانی تھا
دائرہ دائرہ سورج دیکھے
جھیل میں شعلہ فشاں پانی تھا

.....

یہاں نشانیاں موجود ہیں، مفہوم نہیں:

کنارِ ریگِ رواں ہڈیاں چمکتی ہوں
پڑے ہوں اونٹ کہیں اور ساربان کہیں

.....

اور اسی مقام پر مضمون کا اخلاقی محور پوری شدت سے سامنے آتا ہے--- چراغ۔

یہاں ایک بات صاف سمجھنا ہوگی--- نم گرفتہ میں چراغ کوئی رومانوی شبیہ نہیں، نہ ہی امید کا سادہ سا استعارہ۔ یہ چراغ اندھیرے کو رد نہیں کرتا، نہ روشنی کے کسی عظیم وعدے کا اعلان کرتا ہے۔ یہ چراغ دراصل تہذیب کے اندر اخلاقی انکار کی آخری صورت ہے۔۔۔ یہ کہنا کہ سب کچھ مان لیا جائے گا، مگر سوال نہیں چھوڑا جائے گا۔

قاری یہاں ٹھہر کر سوچتا ہے:

''اگر پانی سراب ہے، زبان تھک چکی ہے، دعا کے ہاتھ نیلے ہو گئے ہیں، تو پھر آخر باقی کیا رہ جاتا ہے؟''

اور شاعر جیسے دھیرے سے کہتا ہے:

''چراغ۔''

لیکن یہ چراغ کہاں جلتا ہے؟ کسی منار پر

نہیں، کسی محراب میں نہیں—یہ اندر جلتا ہے۔ یہی اس کی پہلی اخلاقی شرط ہے:

مجھ میں ایک چراغ جلا
جاگ ، اے روشن رُو! مجھ میں

.....

یہ چراغ کسی بیرونی دنیا کی اصلاح یا فوری تبدیلی کی بات نہیں کرتا۔ وہ کسی اجتماعی نجاتی منصوبے کا حصہ نہیں بنتا، نہ اندھیرے کے مقابل کسی فتح کا اعلان کرتا ہے—اس کی پوری قوت اندر کی بے خبری کو للکارنے میں صرف ہوتی ہے۔ یہ چراغ آدمی کو باہر کی تاریکی سے نہیں، اپنے اندر کی آنکھ بند کر لینے کی عادت کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے۔ اسی لمحے نقاد یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہتا کہ یہ روشنی دراصل وہی ہے جسے Immanuel Kant نے اخلاقی قانون کہا تھا— کوئی مسلط کیا گیا ضابطہ نہیں، کوئی خارجی حکم نہیں، بلکہ ایک اندرونی مطالبہ جو خاموشی سے انسان سے حساب مانگتا ہے۔ یہ مطالبہ آدمی کو کسی اتھارٹی کے سامنے نہیں، خود اپنے ضمیر کے روبرو جواب دہ بناتا ہے:

رُوخ دہکائی مری، فکر بھی پگھلائی مری
آنچ دے دے کے نیا رُوپ نکالا تھا مرا

خالد احمد کی شاعری میں چراغ— روشنی کم اور ذمہ داری زیادہ بن جاتا ہے— ایک ایسا داخلی دباؤ جو انسان کو یہ سہولت نہیں دیتا کہ وہ لاعلمی کی پناہ میں خود کو بری الذمہ سمجھ لے:

ہڈیوں تک جھلس گئے خالد
آنکھ نے لَو چراغ کی چکھ لی

چمک اُٹھیں بجھی بجھی آنکھیں
ہم نے دو بوند روشنی چکھ لی

.....

''نم گرفتہ'' میں چراغ کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ وہ اپنی کمزوری کے باوجود دستبردار نہیں ہوتا۔ یہ چراغ نازک ہے، ہوا سے لرز جاتا ہے، ذرا سی بے احتیاطی اسے بجھا سکتی ہے، مگر اس کے باوصف اس میں ایک ضدی پن موجود ہے— ایسا اصرار جو طاقت کے اظہار سے نہیں، محض قائم رہنے کی خواہش سے جنم لیتا ہے۔ یہ شعلہ نہیں بنتا، آگ نہیں لگاتا، کسی بڑے الاؤ کی صورت منظر پر حاوی نہیں ہوتا— اس کی پوری معنویت اسی بات میں ہے کہ وہ بجھنے سے انکار کرتا ہے۔ اسی انکار میں اس کی اخلاقی حیثیت پوشیدہ ہے:

دیے کا دم کہیں اٹکا ہوا ہے
سو، مشکل، بھیڑنا پٹ کا ہوا ہے

.....

خالد احمد اس چراغ کو مختلف مقامات پر مختلف صورتوں میں سامنے لاتے ہیں-- کہیں یہ دعا کی حد تک سمٹ جاتا ہے، کہیں سوال کی صورت روشن رہتا ہے، اور کہیں محض ایک اندرونی یاد دہانی بن کر موجود ہوتا ہے- ہر جگہ اس کی شکل بدل جاتی ہے، مگر اس کی ضد باقی رہتی ہے- یہ چراغ کسی ایک علامتی معنی میں قید نہیں رہتا— حالات کے دباؤ کے ساتھ اپنی معنوی جہتیں بدلتا رہتا ہے- یہ چراغ کسی فتح کا نشان نہیں بنتا، نہ ہی کسی انجام کا اعلان کرتا ہے- یہ صرف اس بات کی علامت رہتا ہے کہ اندھیرے کی کثافت کے باوجود مکمل سپردگی ابھی ممکن نہیں:

چراغِ شام، طاقِ صبح کا تارا ہوا
ستارہ، وقت کے ہاتھوں میں سیارہ ہُوا

.....

چراغ یہاں کسی نئے مفہوم کا اعلان نہیں کرتا، نہ اپنی بقا کو دلیل بنا کر سامنے آتا ہے- وہ وقت کے ساتھ ساتھ بس اپنی جگہ بدلتا رہتا ہے-- کبھی نظر کے کنارے پر، کبھی زبان کے توقف میں، اور کبھی محض احساس کی دھیمی موجودی کی صورت- تہذیب اسے ایک نام سے دوسرے نام تک منتقل کرتی رہتی ہے، اس کے گرد معنی بدلتے رہتے ہیں، مگر چراغ خود کسی نتیجے پر پہنچنے کی جلدی میں نہیں ہوتا- وہ خاموشی سے قائم رہتا ہے، جیسے یاد دہانی کہ مکمل مٹ جانا شاید تہذیب کے اختیار میں نہیں، چاہے وہ بے خبری کو کتنا ہی منظم کیوں نہ کر لے-

''نم گرفتہ'' میں چراغ محض اندر کی روشنی تک محدود نہیں رہتا-- رفتہ رفتہ ایک اخلاقی گواہی کی صورت اختیار کر لیتا ہے- یہ گواہی شور نہیں مچاتی، نہ کسی پر الزام رکھتی ہے-- بس موجود رہتی ہے ---خاموش، مگر انکاری- کئی مقامات پر یوں محسوس ہوتا ہے کہ مسئلہ دنیا کے اندھیرے میں ڈوب جانے کا نہیں-- اس کے حد سے زیادہ روشن ہو جانے کا ہے- یہ وہ روشنی ہے جو ہر شے کو نمایاں کر دیتی ہے، ہر منظر کو قابلِ دید بنا دیتی ہے، مگر اسی عمل میں ذمہ داری کے سوال کو معطل کر دیتی ہے- سب کچھ دکھائی دیتا ہے، مگر کوئی جواب وہ نہیں ٹھہرتا-- ظلم بھی منظر بن جاتا ہے، اور بے حسی بھی محض

اطلاع۔ ایسے میں چراغ کسی نئی روشنی کا اضافہ نہیں کرتا بلکہ اس بے مہار اُجالے کے بیچ ایک اخلاقی وقفہ پیدا کرتا ہے---ایک لمحہ جہاں دیکھنے کے ساتھ سوچنا، اور جاننے کے ساتھ جواب دہ ہونا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ شاید یہ کہنا زیادہ مناسب رہے کہ چراغ یہاں روشنی کے خلاف نہیں، بلکہ اس روشنی کے خلاف کھڑا دکھائی دیتا ہے جو دیکھنے کو کافی سمجھ لیتی ہے اور محسوس کرنے، ٹھہرنے اور سوال اٹھانے کی ذمہ داری سے دستبردار ہو جاتی ہے:

یہ کس کے رُوبرو آئینہ پانی ہو گیا
رُخِ شفاف یکسر آسمانی ہو گیا

.....

اک گھر کے ایک کنج میں ہم راکھ ہو گئے
سمٹے گی تجھ سے خاک چراغِ سحر کہاں

.....

چراغ اس تدریجی بے خبری کے مقابل کھڑا ہوتا ہے۔ وہ سچ کو کسی حتمی، مکمل اور بند صورت میں پیش نہیں کرتا، نہ اسے نعرہ بناتا ہے، مگر اسے مکمل فراموشی کے حوالے بھی نہیں کیا جاتا۔ یہ چراغ سچ کو کسی فیصلے کی طرح سامنے نہیں رکھتا---ایک مسلسل سوال کی صورت روشن رکھتا ہے---ایسا سوال جو جواب سے زیادہ توجہ چاہتا ہے۔ سچ کوئی اعلان نہیں بنتا، مگر اس کی موجودی برقرار رہتی ہے۔ چراغ کی یہ محدود مگر قائم روشنی اس بات کی علامت بن جاتی ہے کہ اخلاقی سچائی کو مکمل طور پر واضح کیے بغیر بھی زندہ رکھا جا سکتا ہے، بشرطیکہ اسے مکمل خاموشی کے سپرد نہ کر دیا جائے:

اعترافِ خبر، اے بے خبری! کیا کرتے؟
اور کچھ بن نہ پڑا ہم سے تو انکار کیا

.....

لیکن چراغ کسی ہجوم کا نشان نہیں، تنہائی کا ساتھی ہے:

ہوا کی چال، ستاروں کا رُخ، سکوت کی سمت
چراغ، صبح کے آثار دیکھ لیتے ہیں

.....

گھر میں نہ اک چھدام تھا، چاند چراغ بام تھا
چاند کی چھاؤں دھر دیا، ہم نے بھی سوت کات کے

.....

ایک جھلمل کا سماں دیکھ کے، اے سروِ رواں!
اِک دیا ہم نے بھی روشن سرِ دیوار کیا

.....

یہ سرِ دیوار جلایا گیا ''دیا'' دراصل تہذیب کے بیچوں بیچ کھڑا ''اِنسان'' ہے---ایسا انسان جو نہ مکمل طور پر اندر کا باسی ہے، نہ

پوری طرح باہر کا راہی۔ وہ حد کے اس مقام پر کھڑا ہے جہاں وابستگی بھی پوری طرح میسر نہیں، اور لاتعلقی بھی ممکن نہیں رہتی۔ دیوار یہاں محض ایک تعمیراتی شے نہیں بلکہ وہ تہذیبی لکیر ہے جو فرد کو شامل بھی رکھتی ہے اور الگ بھی کرتی ہے۔ اس پر جلتا ہوا دیا کسی محفوظ اندرون کی آسائش کا نشان نہیں، نہ ہی کسی کھلے افق کی آزادی کا اعلان--- یہ محض اس بات کی گواہی ہے کہ انسان نے خود کو مکمل تحلیل ہونے سے روک لیا ہے۔

اسی تناظر میں Albert Camus کا یہ خیال معنی اختیار کرتا ہے کہ بغاوت کا پہلا قدم کوئی بڑا انکار نہیں بلکہ بس یہ کہنا ہے کہ یہ حد ہے۔ یہ حد کھینچنا کسی نظام کو الٹ دینے کی خواہش نہیں بلکہ خود کو مکمل طور پر مٹ جانے سے بچانے کی ایک اخلاقی حرکت ہے۔ سرِ دیوار جلتا ہوا دیا بھی اسی حد کا اعلان ہے۔ یہ دیا روشنی سے زیادہ ایک موقف بن جاتا ہے--- ایک ایسی موجودی جو نہ مکمل تعلق کو مانتی ہے، نہ مکمل انقطاع کو، بلکہ اسی درمیانی مقام پر کھڑے رہنے کو اپنی بغاوت بنا لیتی ہے:

اور پھر:

جگنو، چاند، ستارے بجھ گئے آنکھ کنارے
جاگا ساتھ ہمارے ایک دیا البتہ

.....

یہ چراغ سکون نہیں دیتا، آنکھ کو جاگتا رکھتا ہے۔ یہی اس کی تلخی ہے، اور یہی اس کی اخلاقی قوت۔ یہاں شاعر، نقاد اور قاری ایک لمحے کو خاموش ہو جاتے ہیں۔

شاعر نے چراغ رکھ دیا ہے،
نقاد نے اس کی معنویت پہچان لی ہے،
اور قاری اب اس روشنی سے بچ نہیں سکتا--- کیونکہ یہ روشنی راستہ نہیں دکھاتی، صرف یہ یاد دلاتی ہے کہ راستہ پوچھنا ابھی ممکن ہے۔

اس لیے اگر ہم اس مجموعے کو بند کرتے ہوئے تھکے ہوئے محسوس کرتے ہیں، تو شاید یہی اس شاعری کی کامیابی ہے۔ یہ ہمیں سہولت نہیں دیتی، ہمیں شریکِ سوال بنا لیتی ہے۔ اور یہی تہذیبی تنقید کا اصل منصب ہے --- کہ شاعر، نقاد اور قاری ایک ہی خاموش دائرے میں کھڑے ہو کر پوچھیں:

''یہ دیوار ہم نے کب کھڑی کی؟''

''اور اب اسے گرانے کی ہمت کہاں سے آئے گی؟''

☆☆☆☆☆

نعتیہ

سرخ ہوئے، پھر نورنمو سے، پھولوں کے رخسار
عکس جمال یار سے ٹھہرا، ہر چہرہ گلنار

محمل گل سے پاؤں نکالا، رات کی رانی نے
رخنہ رخنہ رچ رچ اتری دیواروں کے پار

قدم قدم خوشبو کے الاؤ پھر سے ہوئے روشن
گل گھوروں پر، پھر سے لگے ہیں رنگوں کے انبار

اک خوشبو سے مہک رہے ہیں آئینہ خانے
زینہ زینہ، نس نس اُتری، چاہت کی مہکار

قصد مدح کیے بیٹھا ہے پھر خالد احمد
شان خدا، خوشبو کے کنگن، ڈھالے گا لوہار

○

نطق کی ہر کونپل سے پھوٹیں پو بن کر افکار
رنگ مثال، بکھر، اے نافہ آہوئے تاتار

دوش سخن پر سیر کو نکلے، تتلی خوشبو کی
گنگ ہنر کے پیڑ پہ اُترے، سات سروں کی ڈار

کون ہوا کے تار میں گوندھے بوندیں پانی کی
کون گلوں کے زر سے کھینچے، مہکاروں کے تار

کس کے عشق کا سورج چمکا، کیسی رُت آئی
ایک ہی سمت اُڑے جاتی ہے، کونجوں کی ہر ڈار

مدح لکھوں میں کس کی خالد، کس کی حمد کروں
رحمت دو عالم ہیں، رحمت کل کے آئینہ دار

○

کس کی نکہت رنگ سے قریہ قریہ گل آثار
کس کے چراغ کی لو سے جھلمل جھلمل طاق بہار

کون دلوں میں الاؤ لگا دے چاہ کی چاہت کے
کس کے در کا پہرہ دینے، جاگیں چوکی دار

کس کا عشق سما دے رگ رگ کس کا فضل عمیم
سینہ سینہ روشن رکھے ایک تپاں مہکار

کون کرے، ہریالی کو غالیچہ تنکوں کا
کون ترخشے تھل پر ڈالے چادر لیل و نہار

کس نرگن کے گن ہیں، مٹی، آگ، ہوا، پانی
کس کے اُفق کا چاند ہیں آقا، یار ہیں کن کے چار

O

ان کے ذکر کا ہالہ ٹھہرے، کیا عجز اظہار
وہ جانِ جاں، وہ آقا، وہ دلبر وہ دلدار

کاش کہ ان کے روپ کی دھوپ پہ سطریں چمکا دے
کاش کہ میری بے ہنری کا رکھ لیں وہ پندار

پل کے پل، بس ایک جھلک، اے آقا، اے آقا!
دم کے دم، اے میرے رہبر، اے میرے سردار!

بے جہت و بے رُخ ہوں، آخر، کب تک چکراؤں
میرا گھر پہلے دن سے تھا، میرا گرد و غبار

میرے بچوں، میرے شہروں، میرے قصبوں کا
حافظ آپ کے صدقے ٹھہرے ستار و غفار

غزل

ایک دل نابینا کر لے، خوشبو کا دیدار
کاش وہ یہ آنکھیں ٹھہرا لیں، اپنی راہ گزار

کیا بتلائیں کس رستے کی انگلی تھامی تھی
گرد راہ حیات ہوا، کیوں دل کا سا شاہ سوار

دن پر دن، راتوں پر راتیں، دھاووں پر دھاوے
لمحہ لمحہ پسپا ہوتے پہنچے گور کنار

دنیا ایک ہمارے پیروں کی زنجیر ہوئی
لوگ دلوں پر پاؤں دھرتے کر گئے دنیا پار

جاں دینے کو جاں نہیں تن میں، دل دینے کو دل
خالی ہاتھ چلے ہیں خالد، آئے تھے بازار

O

نرگس جیسے بیماروں کی، سن لے کون پکار
مٹی کب سنتی ہے مولا، مٹی کی گوہار

کس کا دھڑکا سینہ سینہ دل دھڑکاتا ہے
کس کا نور دلوں کو بخشے آہنگ رفتار

کس کا ہاتھ دکھوں کو سینوں کے اندر تھامے
کس کا نور نسوں میں بھر دے سیال سیار

کس نے سوچ کو بیج، بیان کو علم قرار دیا
کس نے آنسو لڑیاں کر دیں، دانا کی گفتار

کس نے ہوا کی آنکھ میں بھر دی اک نم کی جھلمل
کس کا ذکر آنکھوں کی ٹھنڈک، نام دلوں کا قرار

کون ہوا کو ساکن کر دے، ہاتھ بڑھائے بغیر
زور سکوت سے پانی کر دے، پانی کا پندار

وہی الاؤ پھولوں کے دہکائے چار طرف
وہ تپش کو رنگ بنائے ، لپٹوں کو مہکار

چاند کے ٹھنڈے ہاتھ سے آگ لگا دے پانی میں
کس کے جھلمل عکس سے ٹھہرے آب سرد، شرار

وہی ہوا کے تار میں گوندھے، پانی کے موتی
پل پل لرزاں رکھیں اسی کے ہاتھ ہوا کے تار

مٹی کے دریا میں چلائے مٹی کی ناؤ
مٹی کے پتلے لے ڈوبے، مٹی کی منجدھار

وہی کھنک تڑکتی خاک پکار پہ کان دھرے
کوئی کب سنتا ہے کھنکتی مٹی کی گوہار

کس کے نور لمس سے روشن چہرہ خوشبو کا
کس کے ہاتھ میں ہاتھ مہک کا، کس کا ساتھ بہار

اس کی چاہت، خاک ملاپ کو بستر گل کر دے
ماں کے سونے بیٹنے، ممتا! وہی کرے بیدار

وہ تاریک توانائی ، وہ روشن اندھیارا
خالد ایسا لطیف بدن اور ایسا سایہ دار

باپ کے ہاتھ میں وہی تھمادے بیٹے کی انگلی
وہی عطا کر دے بیٹی کے دل کو ماں سا پیار

O

راہ جمال کی روک نہ پائے ، شیشے کی دیوار
عکس کے ساتھ اترا اے خالد آئینے کے پار

انسانوں کو اک دوجے کے حسن سے پتھرا دے
شیشے کے انسان بنائے ، پتھر کا سنسار

مالک یوم الدین سے مانگ تو دین بھی، دنیا بھی
اس کے دم سے تھل کو جل تھل کر دے رود بہار

وہ ہر نعمت کا مالک ، وہ نعمتوں کے قاسم
کاش مجھے دونوں ٹھہرا لیں رحمت کا حقدار

اس کے آگے کم جانوں کو جان کا خوف نہیں
اس کے آگے برف کے گالے سر بہ فلک کہسار

جاگتی آنکھوں مجھ کو بھی ہو خوشبو کا دیدار
لحظہ لحظہ، پل پل ، دم دم ، دیکھوں وہ گلزار

کاش مری نیندوں میں اُتریں، شاہ براق نشیں
دم بھر، میرے دل میں دم لے، خوشبو کا رہوار

پل کے پل، بس ایک جھلک اے آقا، اے آقا
دم کے دم، اے میرے دلبر، اے میرے دلدار

آپ کا نام امام مقام سر تسبیح رسل
آپ کی ذات بلند صفات اسی تسبیح کا تار

آپ کے ہاتھ قبول کریں تو کنکر بوں اُٹھیں
آپ کے ذکر کا ہالہ ٹھہرے یہ شعری اظہار

مولا، وقت کی گرد کے ہاتھ نہ چھو پائیں مجھ کو
آپؐ کے ذکر کے ساتھ بلند رہیں میرے اشعار

آقا، اے آقا، اے آقا، مجھ پر ہاتھ دھریں
آپؐ کا قرب نہ جانے کیا ہو؟ آپ کی یاد بہار

آپؐ کی آنکھوں کا مرکز ہو، آپؐ کا مدح نگار
بار بھی آپؐ کے در تک پائے ایک سپاس سپار

آپؐ کے در کے سارے رستے خوشبو کے رستے
ساری گلیاں کھلتی کلیاں، شہر تمام بہار

آپؐ کے رخسارے گہوارے یوسفؑ چہروں کے
دل تک بینا کر دیں آپ کے پیراہن کے تار

مجھ کو عطا ہو آپ کے عشق کی گل رنگی چادر
باقی ہر خلعت کی جگمگ رسوائی کا تار

آپؐ کے ساتھی جھلمل جھلمل راہ نما تارے
آپؐ کا گھر ہے دین کی کشتی، گھر والے پتوار

O

صدیقؓ و فاروقؓ ہوں وہ یا عثمانؓ و کرارؓ
چاروں راہ دکھاتے تارے، آپؐ ہیں دین دیار

فقر کو فخر بنایا تھا کیوں، میرے آقا نے
بات بس اتنی پوچھنے جاؤں باب علم و دوار

کاش سلام، امام بلند مقام، قبول کریں
فرش پہ بھی تھے، عرش مقام، وہ دوش نبیؐ کے سوار

آپؐ کی آلؑ کے حب نے رکھی آنکھ ستاروں پر
اس کے ہاتھ میں دے کر ڈوری، تھام لیے پتوار

اک چپو ہیں رب احمدؐ کی نوریں آیات
اک چپو ہے نوریں آقا کا نوریں کردار

وہی زمین پر اپنے دین کا قادر کھیوا تھا
تبھی مسیح دیں ٹھہرایا ، عابد سا بیدار

اسی نے سجدوں کو پھیلایا ، آخری بیری تک
اسی کے علم کا باقر ٹھہرا ، سجاد بیدار

اسی نے دین کی پہنائی ، دنیا کو دکھلائی
اسی نے اہل علم پہ کھولے ، بام و در انوار

دین کا صدق زمین پہ جعفرؑ صادق ٹھہرایا
اسی کے ہاتھ نے تھامے رکھی ، ہر گھر کی دیوار

نور طریق رضا سے رکھا ، روشن نام رضا
اسی کا نام امام موسیٰ کاظمؑ کا پندار

تقوے کی رشنائی سے لکھا ، نام امام تقیؑ
اسی کا زور تقیؑ کو رکھے کمزوروں کی کٹار

اسی کا عسکر ، دین کا لشکر ، عسکری کون ہوا
کس کے ساتھ کیے در پردہ مہدیؑ کے اطوار

اس نے صبح مدینہ مالکؒ ابن انسؒ ٹھہرائے
اسی نے ظلم کی رات کو بخشا شافعیؒ بیدار

وہی امام حنبلؒ رکھے ، سمت نمائے رسول
ابو حنیفہؒ کو ٹھہرائے ، امت کا پندار

O

اور بھی کچھ اونچے ہو جائیں شہروں کے مینار
یہ دنیا وہ مسجد کر دے ، اے رب امصار!

جس مسجد کے سر کی پگڑی ایک ہرا گنبد
جس مسجد کا ایک سفید اور تین ہرے مینار

سینہ سینہ ایک مدینہ پھر سے ٹھہرا دے
اُٹھتی خوشبو جیسے مہاجر ، کلیوں سے انصار

ہر انسان تقدس کا گھر ٹھہرا اے مولا!
ہر دل وہ مسجد ٹھہرا دے ، ہر سینہ وہ دیار

اے رب عشاق احمدؐ! اے رب احمدؐ!
ہر سینے کو روشن کر دے ، اے رب انوار!

چاند کی جھلمل دیکھ کے دنیا جھولی پھیلا دے
دھوپ کا خوف نہ کرنے پائے ، سورج کا انکار

تیری پوریں چن سکتی ہیں ، خوشبو کے موتی
تیری آنکھیں سن لیتی ہیں رنگوں کی جھنکار

O

ان کے دیار کا راہی ٹھہرے ایک غریب دیار
نام ان کے دربار میں پائے، ان کا قصیدہ کار

ایک جھلک کی کھنکتی چاہ میں دل کشکول رہا
اب بے حالی کے کاسے میں کھنکے یہ دینار

بھیک ملے مجھ کو بھی اک گل خیز تبسم کی
مجھ پر بھی اب ٹوٹ کے برسیں جھلمل قول قرار

تصویریں تک چھو کر دیکھوں، جانے کیسے ہوں
وہ ہریالی، وہ جالی، وہ گنبد، وہ مینار

وہ مری پہچان رہیں تا حشر و دم محشر
اور مری بخشش کا وسیلہ ٹھہرے، ان کا پیار

عفو کی بھیک کا طالب ہوں جھولی پھیلا دوں گا
وہ بھی ہولے سے ہنس دیں گے، دیکھ کے دامن تار

کیا جانے کب میری راتیں دن جیسی کر دے
وہ رب عشاق احمدؐ، وہ رب غفار

O

ختم رسل، پیغام بر آخر، انتم اوتار!
اے دست رب نعمت، اے قاسمؐ، اے مختار!

سد نگاہ کے پار اُترنا کس کا فخر ہوا
یہ بھی دیکھ نہ پائے میرے نابینا افکار

قدم قدم معراج انسانیت تھا کس کا
کرن کرن روشن تھا کس کا مہتاب گفتار

کون زمیں پہ فلک سا ٹاٹ بچھائے سوئے رہا
کس کی مہک سے ٹھہری دنیا، راہ گزار بہار

کس کے بدن کے لمس سے ٹھہری، چادر بھی خلعت
تار زر گل ٹھہرا کس کی اترن کا ہر تار

کاش کہ ان کے روپ کی دھوپ تپاں رکھے مجھ کو
کاش کہ تن من جل تھل کر دے ان کے نور کی پھوار

غزل

سوندھی سوندھی سوچ سے اُٹھی، جذبوں کی مہکار
راہ مہک کی روک نہ پائی، لفظوں کی دیوار

مصرع مصرع، اک جھلمل کا رنگلا گھر ٹھہرا
آہستہ آہستہ نکھرے خال و خد اظہار

اے گمنامی! اس میزان کی تول میں جھول نہیں
وہ ناقد نقادوں کا ، فنکاروں کا فنکار

وہ آوازوں کے پیچھے روشن جذبے دیکھے
گن دیکھے، لفظوں کی پتھر دیواروں کے پار

وہ ہر منصوبہ گر سے بہتر منصوبہ گر
ہار بظاہر جیت بنا دے، جیت بظاہر ہار

O

دنیا سے رُخ موڑ کے ٹھہریں، کیوں آدم بے زار
اس دلدل میں دھنسنے والے، اتریں آر نہ پار

وہی مسافر کو ٹھہرائے ، رستے کا پتھر
اسی کے ہاتھ گرا دیتے ہیں، رستے کی دیوار

اس سے سفر کی رخصت لے کر گھر کی راہ لگیں
کیا تارے، کیا چنگارے، کیا ثابت، کیا سیار

اسی نے سیاروں کو ساکن گردش میں رکھا
اسی نے تاروں کو پہنایا پیرہن انوار

وہی پہاڑوں کو پیسے دن رات کی چکی میں
دن کی گرمی، رات کی ٹھنڈک، ریت کرے کہسار

اسی کے روپ کا ساون بھادوں، جیٹھ کو پوہ کرے
اسی کی دھوپ ہے یہ گرمی، سردی، برسات، بہار

کسی کی گور پہ پتھرا دے مرمر کی ویرانی
کسی کی گور کو آپ بنا دے پھولوں کا انبار

کسی چراغ کی لو ابھری یا کشتی کا مستول
شہر کے قبرستان ہیں خالد یا بحر مردار

غزل

رگ رگ رچ رچ اُتری خالد کس تن کی مہکار
کس کی راجائی میں اترے، کس کے باج گزار

ہم پانی میں نمک کہلائے اور زمین پہ شور
مٹی پہ چیتے بستے تھے ، پانی میں سنسار

ہر مچھلی کا پیٹ کسی مچھلی کا مرقد تھا
ہر تن روح کا برتن تھا، ہر چہرہ، سنگ مزار

دیکھ اے دنیا! ایک سی ذلت سب کا نصیب نہیں
ہاتھ پسار کے دیکھ چکے ہم، تو بھی ہاتھ پسار

جوگ کے پاؤں میں چکر رکھنا دنیا داری کا
تن سے کھینچ کے تار نہ کر دیں، یار قبائے تار

چاند کی جھلمل دیکھ کے خالد جھولی پھیلا دی
دھوپ کے خوف سے ہم نے کیا تھا سورج کا انکار

O

ان کے رُخ کا ہالہ ٹھہرے یہ عجز اظہار
ان کے ذکر کے ساتھ بلند رہیں میرے اشعار

میرے ہنر کے عیب پہ گمنامی کے پردے رکھ
اے رب عزت ، اے رب ستار و غفار!

ناموروں کو کب بھائے گئی، میری رسوائی
مجھ کو حضورؐ کی اوٹل رکھنا ، اے رب ستار!

وہ ہر نعمت کا مالک ، وہ نعمتوں کے قاسم
مجھ کو مرے ہادی ٹھہرا دیں ، رحمت کا حقدار

ایک گناہ کی پوٹ ہوں، مجھ کو، تولیں رحمت میں
میرے لیے کچھ نیچا رکھیں، بخشش کا معیار

کاش کہ مجھ پر ہر نعمت رحمت بن کر اترے
اے دستؐ رب نعمت ، اے قاسمؐ ، اے مختارؐ!

اے کم جانوں کے تاجیؐ! بلوانوں کے ہادیؐ!
ختم رسلؐ ، پیغامبر آخرؐ ، ختمؐ اوتار!

پل کے پل، بس ایک ڈلک، اے آقاؐ، اے آقاؐ!
دم کے دم اے میرے دلبرؐ، اے میرے دلدارؐ!

O

لاج وہ رکھ لیں گے میری بھی سائیں کے دربار
صلی اللہ علیہ وسلم ، وہ سچی سرکار

وہ محبوب رب رحیم ، وہ آپؐ رسول کریمؐ
وہ محبوب رب علم و حلم وہ علم دیار

ہر گل ان کا پیرو ، ہر گلزار مدینہ ہے
کیا کیا جگمگ شہر بسے دیوار نگاہ کے پار

گرد کا ڈھیر زر گل آقاؐ کس نے ٹھہرایا
کس نے مجھ سا بن ٹھہرایا آپؐ کی راہ گزار

مدح کروں میں کس کی خالد، کس کی حمد کروں
کس کی راجائی میں اترا، کس کا باج گزار

خالد احمد

ایک مٹھی ہوا

درِ آفاق صبح بند ہوا — صیدِ ظلمات کب رہا ہوں گے
رات کا غلغلہ بلند ہوا — اہلِ غم کب آشنا ہوں گے

روز کا تہلکہ تمام ہوا — خواب دیدہ! سراب دیدہ ہیں
خیمہ زن ، دن ، کنارِ شام ہوا — ہم پسِ خواب ، آب دیدہ ہیں

ہدفِ زحل آفتاب ہوا — خاک اڑتی رہی معانی کی
جلوہ افروز ماہتاب ہوا — دھول بیٹھی نہ خوش بیانی کی

کفِ مشعل پہ ہے چراغِ شام — خیمہ زن آسماں پہ آن ہوئی
کھلکھلا! اے گلِ ایاغِ شام — خاکِ سجادہ آسمان ہوئی

بندِ پیراہن تماشا کھل! — ربِ عزت تری دہائی ہے
اے درِ گلشنِ تماشا کھل! — رہنِ مے ، دلقِ پارسائی ہے

کھلکھلا! گل صفت ، تبسم کر — ہوئے یک جاں نشاط سرگشتہ
یارِ غنچہ نمط ، تبسم کر — ہوئی بزمِ بساط برگشتہ

گنگ ہیں لب ، نگاہ خیرہ ہے — تم تھے شہرِ ہنر میں آسودہ
زلف ہم رنگِ بختِ تیرہ ہے — ہم تھے کسلِ سفر میں آسودہ

گرم کب ہو گا رات کا بازار — پا پیادہ ، برہنہ پا ، ہم تھے
کب چلیں گے نجوم کے دینار — زینتِ جادۂ ہوا ہم تھے

ہم خدا کی رضا کے ساتھ رہے
گرد تھے ، سو ، ہوا کے ساتھ رہے

سیلِ غم ، شہرِ غم اجاڑ نہ دے
بیخ و بن سے ہمیں اکھاڑ نہ دے

راستوں کو ہوا نے گھیر لیا
بھاگتوں کو خدا نے گھیر لیا

جاں طبق در طبق سلگنے لگی
آنکھ ، محراب صبح لگنے لگی

شہر ، حاجت روا کے ہاتھ لگے
اور صحرا ، ہوا کے ہاتھ لگے

یادِ یارانِ مہرباں آئی
دم میں دم آیا ، جاں میں جاں آئی

خاک ٹھہرے ، گیاہ پوش رہے
عمر بھر ہم سیاہ پوش رہے

وا درِ غرفۂ تپاک ہوا
یا گریبانِ صبح چاک ہوا

کچھ دل اپنا ، زوال پیشہ تھا
کچھ فلک کوتوال پیشہ تھا

رایتِ غم نشاں بلند ہوا
سرِ بے خانماں بلند ہوا

غرق بوس و کنار ، پار لگے
ایک کھٹکے میں یار ، پار لگے

اے نگارِ بہار آسودہ
کس جگہ ہو غبار آسودہ

لوگ طعنے مہک کے دیتے ہیں
پھول صدقے مہک کے دیتے ہیں

گوشۂ دشت میں پڑے تھے ہم
صورتِ نخلِ غم کھڑے تھے ہم

گھر گھر اچھی مہک بسا آئی
ایک غنچہ دہن کی رسوائی

ہم تماشا ، سرِ جہاں ، ٹھہرے
پردہ بردار ، شادماں ٹھہرے

اب ہوائیں ہیں ، پاسبانِ چراغ
چاٹ جائے نہ گھر ، زبانِ چراغ

خندہ زن ، جگ ہنسائی ہم پر تھی
تہمتِ پارسائی ہم پر تھی

ہم تو بہرِ رسائی بیٹھے تھے
سرِ خاک جدائی بیٹھے تھے

نورِ صبحِ امید کے مالک
اے سیاہ و سپید کے مالک

جانِ جاں ، ہم سپاس پیرا ہیں
دیکھ ، ہم التماس پیرا ہیں

تیرے مانند کون ہے میرا
اے خداوند کون ہے میرا

کج ادا ، کج سروں میں ، رہتے ہیں
ہم تری ٹھوکروں میں رہتے ہیں

دودۂ یار کی دمک دیکھی
غرفۂ یار کی چمک دیکھی

گھر میں تھا کیا کہ رہن رکھ آتے
دل چھڑاتے تو ذہن رکھ آتے

کوئی پیرایۂ بیاں نہ ملا
میرے تاروں کو آسماں نہ ملا

درِ 'فریاد رس' نہیں کھلتا
کیوں طلسمِ قفس نہیں کھلتا

چار سو تھا ، ہجومِ رعنائی
کون چنتا ، نجومِ دانائی

کھل گیا راستہ ہلاکت کا
بچھ گیا بوریا فلاکت کا

کچھ زمینی ، کچھ آسمانی تھے
حسن کے رنگ جاودانی تھے

دل ، طنابِ خیامِ یاس ہوا
عذر کھنچ کھنچ کے التماس ہوا

تھام کر آستیں جدائی کی
عشق نے حسن کی گدائی کی

آس ، نورِ چراغِ یاس رہی
پیاس پانی کے آس پاس رہی

عشق نے اور کچھ کیا نہ کیا
حسنِ دنیا کا مبتلا نہ کیا

غم ، بیاں ، غم ربا سے کر دیکھیں
آج باتیں خدا سے کر دیکھیں

میری رہ کر بھی مِلکِ یار ہوئی
زندگی دُرجِ سلکِ یار ہوئی

قید سے صیدِ غم ، رہا نہ ہوا
چشمِ امید ، حسرتِ دیدار
کوئی ناخن گرہ کشا نہ ہوا
دیکھ ، احوالِ نرگسِ بیمار

تیرا حلقہ بگوش کیا کرتا
آتشیں پیرہن قیامت ہے
ایک خانہ بدوش کیا کرتا
گلشنِ رنگ زیبِ قامت ہے

میری فردِ گناہ کے مالک
آنکھ کھلنے کا انتظار رہے
اے سپید و سیاہ کے مالک
جان ، جویائے حسنِ یار رہے

حزن آسودۂ بیاں ، نہ ہوا
پھول چنتے رہو ، بیاں کے لیے
بند مٹھی میں آسماں نہ ہوا
یہ ستارے ہیں آسماں کے لیے

تارِ غم ، بارِ جاں تھا ، کاٹ دیا
زندگی باعثِ فراغ رہے
پیار اندھا کنواں تھا ، پاٹ دیا
روغنِ کاسۂ چراغ رہے

فنِ نغمہ سرائی ، بھول گئے
دیدۂ انتظار بینا ہو!
یارِ تازہ نوائی بھول گئے
چشمِ نرگس شعار بینا ہو!

کارِ کاسہ گری تمام ہوا
اے نگاہِ نگاہ روشن ہو!
نطق گویا ، پسِ کلام ہوا
ماہِ شامِ سیاہ روشن ہو!

پردہ برادرِ سایۂ اشجار
سطرِ فردِ سیاہ کار ہوئی
پھول فرطِ غضب سے ہیں گل نار
رات ہم رنگِ زلفِ یار ہوئی

با ادب جرأت آزما ہونا
یارِ ساغر بدست بیٹھے تھے
دست بستہ غرض رسا ہونا
ہم سے سرشار مست بیٹھے تھے

کیا مہک کر وہ ہجر زاد کھلا
سرِ محفل گلِ مراد کھلا

جلسہء انبساط ختم ہوا
ایک دورِ نشاط ختم ہوا

چار سو ، ایک حشر برپا تھا
یار چپ تھے ، عجیب غوغا تھا

آج کا کام ، کل پہ ٹال دیا
قفل باب ہوس پہ ڈال دیا

ذات کے بلبلے میں قید ہوئے
یار اپنی انا کے صید ہوئے

اے بیاباں نورِ تنہائی
دیکھ سمتِ ہوائے رسوائی

ہمہ تن گوش ہو گئے گل بھی
ہم سے پروردۂ تغافل بھی

خاک سے پھول بن کے نکلے ہیں
رنگ ، خوشبو پہن کے نکلے ہیں

گلِ نو خاستہ بھی اک تم تھے
ہنر آراستہ بھی اک تم تھے

داد کے گھاٹ فن اتار دیا
رمز نے پیرہن اتار دیا

تم تو مہتاب چہر تھے ، چپ تھے
ہم بھی محورِ سحر تھے ، چپ تھے

سطر در سطر ، تن تراشتے تھے
ہم بتانِ سخن تراشتے تھے

ایک طوفاں اُٹھا کے بیٹھ گئی
گرد مسند بچھا کے بیٹھ گئی

چھوئی موئی سخن چراتے تھے
لفظ ہم سے بدن چراتے تھے

گردِ دنیا میں ٹپ گئے ہم بھی
اپنی نظروں سے چھپ گئے ہم بھی

موج در درج پیرتے تھے ہم
کبھی آنکھوں میں تیرتے تھے ہم

عشق میں رفتہء گمان رہے
ہم بھی خس پوش کھڈ میں آن رہے

لفظ در لفظ آزری کی تھی
دھوم ہر سطر سامری کی تھی

ایک جادو صدا نہ تھا ، ہم سا
کوئی تازہ نوا نہ تھا ، ہم سا

لوگ سرگشتگی کے مارے ہیں
سرجِ برگشتگی کے تارے ہیں

زینتِ مسندِ نگاہ تھے ہم
وجہِ تزئینِ بارگاہ تھے ہم

آسمانِ ملال پھر چمکا
درد زہرہ خصال پھر چمکا

ایک دن ، کرکے آہ ، بیٹھ رہا
دِل سرِ بارگاہ بیٹھ رہا

رات بھر گل چراغ طاق رہا
غرقِ مے ، غم کشِ فراق رہا

پردۂ ساز ، تار تار ہوا
حزن کا حسن آشکار ہوا

یہ تری رت ہے ، یہ ترا موسم
سر اُٹھا نخلِ گریۂ و ماتم

قربتیں بن کے دکھ برسنے لگیں
بستیاں، فاصلوں میں بسنے لگیں

انتظارِ نشاطِ ماتم کھینچ
ہر نفس انبساطِ ماتم کھینچ

دل سے رنج و ملال یار ہٹا
پردۂ قالبِ غبار ہٹا

خاکساری کی وہ ہوا نہ رہی
انکساری کوئی ادا نہ رہی

پسِ صوت و صدا کلام ہوا
کار نغمہ گری تمام ہوا

لوگ لوگوں سے پیار کرتے تھے
یار جانیں نثار کرتے تھے

لوگ آمادۂ جدال ہوئے
رونقِ عرصہء قتال ہوئے

دل فقط دل کے مول بکتے تھے
پھول ، خوشبو کی تول بکتے تھے

آگ کا آسماں سا پھیل گیا
کوبکو اک دھواں سا پھیل گیا

اب وہ سستا زمانہ خواب ہوا
آب مدّت ہوئی سراب ہوا

پھول جھڑتے نہیں زبانوں سے
مہک اُٹھتی نہیں بیانوں سے

گر کچھ آبادیاں تمہاری ہیں
پھر سب آزادیاں تمہاری ہیں

لفظ ہندسے ہیں، لوگ ہندسے ہیں
اب تو ہر دل کا روگ، ہندسے ہیں

باد و باراں کی سازشیں نہ تمھیں
قحط آثار بارشیں نہ تمھیں

معتبر ہندسے مانے جاتے ہیں
لوگ ہندسوں سے جانے جاتے ہیں

قد سے نیچا سرِ نیاز رہے
صرف دستِ طمع دراز رہے

دوست کتنے ہیں، یار کتنے ہیں
ایک جاں پر ادھار کتنے ہیں

کوزنش گو کھڑے رہیں در پر
اہلِ حاجت پڑے رہیں در پر

دامنِ حرص و آز کتنا ہے
کس کا دامن دراز کتنا ہے

آج کی بھوک آج رہن رکھیں
کل کی کل احتیاط رہن رکھیں

سطر در سطر حرف کتنے ہیں
شہر میں اہلِ ظرف کتنے ہیں

مرضِ لا علاج ہوتی ہے
احتیاج، احتیاج ہوتی ہے

کتنے بازو میں، زور کتنا ہے
شہر کتنا ہے، شور کتنا ہے

یہی اندازِ ارتکاز رہے
سر بہ زانو، سرِ نیاز رہے

گرد کتنی، غبار کتنا ہے
سرِ مفلس، پہ بار کتنا ہے

ہر نفس ابتلا میں رہنا ہے
ہمیں ملکِ خدا میں رہنا ہے

اہلِ فن ہو تو شور دکھلا
پیل تن ہو، تو زور دکھلا

کوچۂ نا و نے کو چلتے ہیں
پھر سرِ میکدہ نکلتے ہیں

طوفِ بیتِ الم بھی کر لیں گے
ہم زیاراتِ غم بھی کر لیں گے

کیا کہیں کیا لباس پہنے گا
کتنے رنگوں کی باس پہنے گا

وارث خاکِ رفتگاں نہ ملے
ہمیں قبروں کے بھی نشاں نہ ملے

ہم تمنا شہید کیا جانیں
اس کا رنگِ وعید کیا جانیں

چشمِ عبرت گزیں دکھائی نہ دی
خاک اُڑتی کہیں دکھائی نہ دی

ارغوانی لباس میں آیا
رات پانی لباس میں آیا

شہرِ صولت نمط میں اُترے تھے
یار کس تمکنت میں اترے تھے

کوئی شک کی اساس بھی تو نہیں
کچھ بعید از قیاس بھی تو نہیں

آنکھ میں آسماں سمیٹے ہیں
دیکھ ، تختِ رواں پہ لیٹے ہیں

گوشہ دشتِ یاس ہوتی ہے
عقل باب قیاس ہوتی ہے

اب وجودِ گمان دیکھیں گے
گور سے آسمان دیکھیں گے

جو کوئی اپنی راہ چلتا ہے
اسی صحرا میں آ نکلتا ہے

سال دن کا حساب ختم ہوا
فرق آب و سراب ختم ہوا

وہی نرگس سے باج لیتا ہے
بھیک دے کر خراج لیتا ہے

کب وہ غفلت شعار غافل تھا
وہ الگ رہ کے خوں میں شامل تھا

اے خدا خود پرستیاں دیکھیں
اپنے بندوں کی مستیاں دیکھیں

آگ تقدیرِ آب کر دے گا
اور پانی شراب کر دے گا

مرمٹیں کج ادائیاں تم پر
ختم تھیں بے وفائیاں تم پر

عیب اک گن ہے، پاپ اک پُن ہے
فسق ، سرمایہء تمدن ہے

رنگ فرہنگِ بے زبانی ہیں
مکر و فن آج ہم معانی ہیں

دل ہیں یا پارہ ہائے آرائش
اے شبستانِ خواب آسائش

سرِ رودِ شرابِ ناب چلا
بطِ پیمانہء حباب چلا

کون اُٹھ کر کنارِ ناز چلا
آب ساں سایۂ نیاز چلا

اب نگاہ کرشمہ ساز اُٹھا
اُٹھ ہمارا سرِ نیاز اُٹھا

گھر تو اہلِ ستم نے لوٹ لیے
اور دل اہلِ غم نے لوٹ لیے

بے علم ، بے نشان ، ٹھیک رہے
چارہ گر لوٹ میں شریک رہے

سرِ مفلس کا تاج باقی ہے
مسندِ احتیاج باقی ہے

مستِ مے ، اہلِ تخت و تاج رہیں
اہلِ غم ، مستِ احتیاج رہیں

اہلِ امید سر اٹھائے رہیں
سر پہ دیوار و در اٹھائے رہیں

زین پیرا تہِ زمام نہ ہوں
رخشِ صرصر نژاد رام نہ ہوں

کوبکو گھومتے ہیولے ہیں
شہر میں دشت کے بگولے ہیں

خون تشنگی سلوں پہ بولے گا
درد دھاوا دلوں پہ بولے گا

جب پسینہ جبیں سے پھوٹے گا
دانہ بنجر زمیں سے پھوٹے گا

دیکھنا ! خاک ہو چلیں جھیلیں
کتنی بے چین ہیں ابابیلیں

سر زمینِ زیاں ربا کے لیے
اک مٹھی ہوا ، خدا کے لیے

خالد احمد

عصر

صدا نے کھینچے ہوا سے پھندے
سمٹ گئیں گونج کر اذانیں
وہ ٹکڑیوں میں اڑے پرندے
وہ ٹکڑیوں میں بٹیں اڑانیں
وہ تیر سنکے ، چلیں کمانیں
ابھی لہو کی دھنک کھلے گی
چپک رہی ہیں ابھی زبانیں
سرِ فلک اک لپک کھلے گی
دلوں کے اندر کسک کھلے گی
کہاں گیا شام کا پرندہ؟
کہاں پہ خونیں ڈلک کھلے گی؟
کہاں گرا شام کا پرندہ؟
یہ رات آنکھوں میں کٹ نہ جائے!
یہ ذات ٹکڑوں میں بٹ نہ جائے!

خالد احمد

غزل

مری بات کہتے رہنا، یہ قلم اُٹھائے رکھنا
یہ علَم فرو نہ کرنا، یہ فلک سجائے رکھنا

ابھی آسماں کُھلیں گے، ابھی بادباں کُھلیں گے
سبھی لوگ سیکھ لیں گے، کبھی اپنی رائے رکھنا

ابھی پھول کِھل رہے ہیں، ابھی چاک سِل رہے ہیں
مرے غم نبرد یارو! ابھی سر اُٹھائے رکھنا

نہ تھمے غموں کی قُلقُل، تہِ کاسۂ زرِ گل
مرے درد کے رفیقو! زرِ غم لٹائے رکھنا

تہِ آسمانِ دُنیا، سرِ خاک دانِ دُنیا
مرے ساتھ ساتھ رہنا، مجھے سائے سائے رکھنا

مرا رُخ بدل نہ جائے، مرا تن پگھل نہ جائے
مرے درد کی نظر سے، مرا فن چھپائے رکھنا

یہ قبا نہ تار کرنا، نہ جدا یہ تار کرنا
یہی داغ، آگہی ہے، سرِ دل سجائے رکھنا

مرے رُوبہ رُو خدا تھا؟ کہ تُو مجھ میں رُونما تھا؟
مجھے راس کیوں نہ آیا، مرا سر اُٹھائے رکھنا

مری بات تک پہنچنا، تہِ ذات تک پہنچنا
مرے لفظ عام کرنا، مرا غم چھپائے رکھنا

تہِ لفظ سو چکا ہوں کہ مَیں لفظ ہو چکا ہوں
مری بات کہتے رہنا، مرا غم چھپائے رکھنا

کبھی پھول ڈال جانا، کبھی دُھول ڈال جانا
مری بزم سے کشادہ، مری غم سرائے رکھنا

خالد احمد

غزل

گو، کرمکِ شب تاب تھا، روشن تو رہا میں
سورج کی طرح گم نہ اندھیروں میں ہُوا میں

لوگوں کے لیے ایک گلِ کاوِ لحد تھا
اے ارضِ وطن! ہوں، تری مٹی کا دیا میں

سودا نہ مرے سر سے ٹلا نوحہ گری کا
بستی میں اذانوں کی طرح گونج گیا میں

کچھ یاد ہے، اے غلغلۂ طوق و سلاسل!
کس خانۂ زنجیرِ حوادث میں رہا میں

خالد یہی کشکول تھا اُمت کا اثاثہ
بیٹھا ہوں سرِ راہ گزر توڑ کے کیا؟ میں

خالد احمد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سب کا ایک مالک تھا، یہ زمین سب کی تھی
یاد ہے خُدا والو، یہ خدا کی بستی تھی

غزل

خالد احمد

مجھ سے طلوعِ صبح کے منظر چھپا گئی
ٹھنڈی ہوا چلی تو مجھے نیند آ گئی

آنکھیں گراں گراں رہیں نیندیں دھواں دھواں
وہ دھند کی طرح مرے خوابوں پہ چھا گئی

گھل مل چلا تھا شب کے اندھیرے میں اک گناہ
دھیرے سے در کو موج ہوا کھٹکھٹا گئی

خالد شعور شعر کہاں تھا مجھے، مگر
اظہار کی خلش تھی کہ شاعر بنا گئی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کِس انا کے بندے نے جان وار دی خالد
جاہ زر پرستی یا یہ خُود پرستی تھی

الوداع

بلقیس ریاض

باہر موسم بے انتہا سرد تھا....آسمان مکمل نیلا اور بے داغ تھا۔ ہر چیز تیز ہوا کے لپیٹ میں تھی..غرض کہ درختوں کے پتے سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے ....وہ پلنگ پر لیٹا ہوا....چھت کو گھور رہا تھا....آہستہ آہستہ کمرے میں لوگ آنے شروع ہوگئے۔ اس نے حیرانی سے دیکھا کچھ دوست احباب، کچھ رشتہ دار اور کئی یونہی آن کر اسے دیکھتے اور باہر نکل جاتے اس کی حیرانی بڑھتی جاتی۔ آخر گھر میں اتنے سارے لوگ بغیر بولے چالے آتے اور چلتے بنتے....شاید گھر میں کوئی تقریب ہو رہی ہے....یا....کوئی اچانک بیمار ہوگیا ہے۔ اگر ایسی تقریب ہوتی تو سب کے چہرے اداس کیوں ہیں...کیا میری بیماری اتنی ہی طول پکڑ گئی ہے کہ لوگ دھڑا دھڑ چلے آرہے ہیں ۔ تب ہی وہ خاموش خاموش دکھائی دے رہے تھے....وہ کھلی آنکھوں سے سب کی جانب دیکھ رہا تھا۔ نہ جانے ان سے بات کرنے کو جی کیوں نہیں کر رہا تھا۔ فضا میں سردی کی لہر بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر ایک دم سے جہاں آرا کو دیکھا....وہ اس کے سرہانے کھڑی تھی اور کچھ سوچ رہی تھی سامنے دیوار پر میری

تصویر آویزاں تھی اس کو غور سے دیکھتے ہوئے اس کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔

جہاں آرا کو دیکھ کر کالج کا زمانہ یاد آ گیا....کلاس کے باہر نکلتی تو کئی لڑکے اس کے پیچھے نکلتے....ہر ایک کی کوشش ہوتی کہ جہاں آرا سے بات کرے اور اس کی اداؤں سے لطف اندوز ہو....مگر وہ کسی کو گھاس نہیں ڈالتی تھی....اتنی حسین جو کوئی دیکھتا تو دیکھتا ہی رہ جاتا....اکثر وہ باہر کمپاؤنڈ میں بیٹھا سارا تماشہ دیکھتا....اور وہ شان بے نیازی سے اس کے قریب سے گزر جاتی....ہر ایک کی تمنا ہوتی کہ وہ اس کو دیکھ کر کھڑا ہو جائے اور ہیلو ہائے کہے مگر....وہ خاموش سا بیٹھا رہتا اور اتنی تاب نہ ہوتی کہ اس سے بات چیت کر لے۔

میں درخت کی ٹہنیوں سے ہوا کے زور سے گرتے پھولوں کو دیکھتا....کالج کے باہر ایک یہی درخت تھا جو پھولوں سے بھرا چار سو خوشبوئیں بکھیرتا تھا....کئی پھول اس کے پاؤں کے گرد گر کر اس کے دل میں ہلچل مچا اٹھتے....تو جہاں آرا ہنس کر کہتی۔

''ارے فواد....دیکھا....پھولوں کی پتیاں تم پر نچھاور ہو رہی ہیں۔

وہ نظر اٹھا کر دیکھتا تو جہاں آرا خود ایک تر و تازہ شاداب پھول کی مانند اس سے مخاطب ہوتی....وہ دھیرے سے مسکراتا اور کہتا....یہ پھول تمھیں دیکھ کر ڈالیوں سے اترے ہیں۔

''اچھا'' اس نے فواد کی جانب نظریں چار کرتے ہوئے کہا۔

نہ جانے روز یہاں بیٹھ کر کون سی گتھی سلجھاتے ہو۔ فواد تم دوسرے لڑکوں سے کتنے مختلف ہو....ہر کوئی مجھ سے پیار کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر میں.....ہاں کہو....تم....بات کیوں نہیں کرتی۔

بہت اچھے لڑکے ہیں۔

بیچارے بات چیت کرنا چاہتے ہیں....ایسا نہ کہو۔

''اتنے معصوم نہ بنو.....میں اچھی طرح سے جانتی ہوں.....ٹائم پاس کرنا چاہتے ہیں۔ ...مگر تم ایسے نہیں ہو''۔

''جہاں آرا''۔

فواد نے اپنی نگاہیں اٹھائیں....تو وہ تمام تر رعنائیوں کے ساتھ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ فواد کا دل قابو میں نہ رہا....جی چاہنے لگا کہ اسے کہہ دے....میں تمھیں بہت پسند کرتا ہوں مگر پھر خیال آیا کہ وہ کہتی ہے کہ تم دوسرے لڑکوں سے مختلف ہو....پھر....وہ سوچے گی کہ میں بھی ویسا ہی ہوں۔ جہاں آرا سامنے کھڑی تھی مگر اس میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ اظہار عشق کر سکے....نگاہوں میں محبت رچی تھی....اور

اس کے لب سلے ہوئے تھے....نگاہوں میں محبت کا پیغام تھا مگر.....وہ اس کے لبوں سے اٹھتی ہوئی محبت کے الفاظ جو کئی مہینوں سے اس کے دل میں پنہاں تھے - سننا چاہتی تھی....وہ خاموش تھا....اور وہ اس کا جواب سنے بغیر پارکنگ لاٹ کی جانب بڑھ گئی....اور فواد دل ہی دل میں اپنے آپ کو کوستا رہا....اور اس کی گاڑی آنکھوں سے اوجل ہوگئی۔

دن رات اسی کشمکش میں گزرنے لگے....وہ اکثر اس کے قریب بیٹھ کر بتاتی۔

فواد جانتے ہو.....نہ جانے والدین کو میری شادی کی اتنی فکر کیوں ہے۔ امی کہتی ہیں کہ اس امتحان کے بعد تمھاری شادی کردیں گے۔

''اچھا''....فواد اداس ہوگیا۔

''میں نے دل میں سوچا....شادی....کے لیے کیسے کہوں.....میری تو منگنی ہو چکی ہے....وہ بھی خالہ کی بیٹی کے ساتھ....اگر جہاں آرا سے کہوں تو گھر میں کہرام مچ اٹھے گا۔ پھر....محبت کرتا بھی ہوں تو بتانے کی کیا ضرورت ہے۔ فواد کو لگ رہا تھا کہ وہ چاہتی ہے کہ میں اسے کہوں کہ میں پرپوز کروں گا۔ مگر میں خاموش رہا....تو وہ بددل ہوکر چلی گئی۔ امتحان ہوئے اور دونوں ہی کامیاب ہو گئے....اور جہاں آرا کی منگنی ایک کھاتے پیتے گھرانے کے لڑکے سے ہو گئی....مگر اکثر فواد کو فون کرتی اس کا حال احوال پوچھتی۔ ایک روز جہاں آرا نے اپنی منگنی کی خبر سنائی تو پوچھا۔ تمھارا کیا بنا۔

اس نے دھیرے سے آہ بھر کر کہا۔

میری تو کئی سالوں سے منگنی ہو چکی ہے۔

''تم نے کبھی بتایا ہی نہیں تھا''۔

''بس ہمت ہی نہیں پڑی تھی کہ کہوں میں منسوب ہوں''

''تو کیا''

''ہاں جہاں آرا منگنی نہ ہوئی ہوتی تو تم سے ضرور شادی کرتا''۔

''کیا اس کو بہت چاہتے ہو''۔

سوچا ہی نہیں....خاندان کی بیٹی ہے....بڑی بے دلی سے کہا....بس اچھی ہے۔

''تو محبت نہیں کرتے''۔

فواد خاموش ہوگیا۔

''بولو''

''کہا تھا کہ اچھی ہے''۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم اس سے محبت نہیں کرتے''۔

''محبت کا کبھی خیال ہی نہیں آیا''۔

''کوئی تو پسند ہوگی''۔

''چھوڑو کوئی اور بات کرو....جس سے منگنی ہوئی ہے''۔

''کیا وہ تمہیں چاہتا ہے''؟

''کوئی ایسا ویسا....بڑی چاہت سے منگنی

رچائی ہے"۔

"تو کیا تمہیں بھی اتنا پسند تھا"۔

"بس گزارہ....وہ چاہتا ہے اتنا ہی کافی ہے....میری شادی اگلے ماہ ہو رہی ہے تم ضرور آنا"۔

فواد نے دھیرے سے جواب دیا۔

"کوشش کروں گا"۔

"نہیں تم نے ضرور آنا ہے"۔

دوسرے مہینے وہ اس کی آنکھوں کے سامنے کسی اور کی ہو گئی....اور وہ نیم بسمل تھا....سٹیج پر مبارک دیتے ہوئے کہنے لگا۔

"بہت مبارک ہو"۔

جہاں آرا نے اس کی آنکھوں میں جھانکا....تو آنکھوں کے گوشے بھیگے ہوئے تھے۔

"الوداع" اور دوسرے لمحے وہ گھر پہنچ کر پھوٹ پھوٹ رونے لگا....اور دو سال کے بعد اس کی اپنی شادی بھی ہو گئی....اور اس بات کو کئی سال بیت گئے....پھر وہ السر کی بیماری میں مبتلا ہو گیا....اور نڈھال سا بستر پر پڑا رہتا....اس وقت اس کے کمرے میں کوئی نہیں تھا....جہاں آرا مسلسل رو رہی تھی....نرس اسے نہلانے کے لیے غسل خانے میں لے جانے لگے تو اس نے سوچا ابھی تو صبح نہایا ہوں تو اب پھر نہانے کے لیے کیوں لے کر جا رہے ہیں....نہانے کے بعد وہ جہاں آرا کو ضرور بتائے گا کہ وہ اسے چاہتا تھا....جونہی نرس نے نہلانا شروع کیا تو ساتھ ساتھ تیسرا کلمہ پڑھتا گیا ....پھر سفید لباس زیب تن کیا تو جہاں آرا ابھی بھی اس کے کمرے میں کرسی پر بیٹھی آنسو بہا رہی تھی تو اسے ایک دم سے لگا....یہ تو میں ہی ہوں جو دنیا چھوڑ کر جا رہا ہوں....اس لیے لوگ مجھے دیکھ رہے ہیں ....اب سمجھ میں آیا کہ میں مر گیا ہوں....اور جہاں آرا....رو رہی ہے۔

کیوں....تو کیا یہ بھی مجھ سے بہت محبت کرتی تھی....وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا....جہاں آرا میں تم سے محبت کرتا تھا۔ تم سے....مگر اس کی آواز کوئی نہیں سن رہا تھا۔ الوداع جہاں آرا.....آج میں الوداع کہہ رہا ہوں....اتنا کہنے کے بعد اس کا دھیان اگلی منزل کی طرف چلا گیا جہاں دنیا ہی اور تھی....کمرے میں سناٹا چھایا ہوا تھا....اور بہت سے مرد کلمہ شہادت کہتے ہوئے جنازہ اٹھا رہے تھے....جہاں آرا مسلسل رو رہی تھی مگر....اسے کچھ نہ کہہ سکا تھا۔ اس کے لب ابھی بھی سلے ہوئے تھے....جہاں جہاں سے رشتہ دار، دوست احباب اس کی میت کے قریب کھڑے تھے سب کو دیکھ رہا تھا مگر....لبوں پر قفل لگ گیا تھا.....اور اگلی منزل کی طرف گامزن تھا۔

☆☆☆☆☆

آج تم بے حساب یاد آئے [22 جنوری 2026]

آج گھر سے جدا ہوئے مجھے لگ بھگ دو برس ہونے کو آئے ہیں۔ ان دو برسوں سے پہلے میں نے اپنی زندگی کی چونتیس سردیاں ماں کی نرم و گرم آغوش میں بسر کی تھیں۔ اس مامتا کی حرارت کے ساتھ ساتھ بابا جان کی شفقت کی وہ مضبوط چھاؤں بھی میسر رہی، جو مجھے زمانے کی تند و تیز ہواؤں اور حالات کی بے رحم شدت سے بچاتی رہی۔

مجھے سردیاں ہمیشہ عزیز رہی ہیں، مگر پچھلے دو برسوں سے ماں کی رضائی کے بغیر نیند پوری نہیں آتی۔ وہ حرارت اب میسر نہیں رہی، نہ ہی سحر کی وہ پہلی صدا سنائی دیتی ہے: ''اویس، اٹھ جاؤ، دیر ہو رہی ہے۔''

آج میں اپنے گھر میں رہتا ہوں — دنیا یہی کہتی ہے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ ماں باپ کا گھر چھوڑ کر میں سردیوں کے کسی ہمالیہ میں آ نکلا ہوں، جہاں موسم نہیں، احساس جم جاتے ہیں، اور کچھ بھی اثر نہیں کرتا۔

چند لمحے پہلے ہی میں امی ابو کے پاس تھا، محض دو گلیاں دور۔ وہاں میں اور میرا بڑا بھائی دوہری شناخت (Hybridity) پر گفتگو کر رہے تھے، مگر آج میرا دل کسی بحث کا خواہاں نہ تھا۔ میں تو صرف امی ابو کی باتیں سننا چاہتا تھا، ان کے لہجوں کی شفیق گرمی اپنے ساتھ لے آنا چاہتا تھا — مگر آج وہ گرمی ساتھ نہ لا سکا۔

مجھے یاد ہے، بچپن کے جاڑوں میں جب ہم سلیپر پہن کر باہر کھیلنے نکل جاتے تھے۔ نہ پاؤں میں بند جوتوں کی فکر ہوتی، نہ سر پر ٹوپی کی ضرورت۔ کیونکہ ہم سب بھائی ماں کے بنے ہوئے وہی اونی سویٹر پہنا کرتے تھے — جو پہلے فیصل نے پہنی، پھر احسن نے، اور پھر میں نے۔

سالہا سال پہنی جانے والی وہ جرسی اتنی گرم ہوتی کہ ٹھنڈی ہوا اور شدید سردی اس کے سامنے دم توڑ دیتی۔

آج میرے پاس تین جیکٹیں، تین سویٹر، آٹھ کوٹ اور نہ جانے کیا کچھ ہے، مگر سردی ہے کہ روح میں اترتی چلی جاتی ہے۔ کیونکہ اب وہ آشیانہ باقی نہیں رہا جہاں ماں کی مامتا کی حرارت ہمیں سردی اور گرمی دونوں سے بچا لیتی تھی۔

چند دن پہلے میری بیوی دونوں بچوں ولی اور زمنہ کے ہمراہ اپنے میکے گئی ہوئی تھی۔ ان دنوں میں نے جیسے دوبارہ اپنا بچپن جیا۔ ایک ہی بستر پر کپڑا بچھا کر کھانا کھایا، ماں کے ہاتھ کی چائے پی، اور سب سے بڑھ کر ماں کے ہاتھ کا پراٹھا کھایا۔ نہیں معلوم میری ماں کے ہاتھوں میں کیسا جادو ہے — لقمہ حلق سے اترتا ہے تو گزرے برسوں کے وہ سارے لمحے آنکھوں کے سامنے گھوم جاتے ہیں،

محمد اویس بیگ

جب ہم سب ایک ہی چھت کے نیچے رہا کرتے تھے۔
جب ہم باہر کھیل کر لوٹتے،
سردی سے ہاتھ پاؤں پھٹ جاتے،
تو ماں پانی کا پتیلا گرم کرتیں،
جالی دار کپڑے سے ہمارے منہ، ہاتھ اور
پاؤں رگڑ رگڑ کر صاف کرتیں،
پھر سرسوں کا تیل لگاتیں یا اُس دور کا مشہور لوشن "عمت"۔
اور ذرا سی ڈانٹ کے ساتھ ہمیں سلا دیتیں۔
پتا نہیں وہ ڈانٹ کا اثر ہوتا
یا ماں کے ہاتھوں سے لگی ہوئی تبت کا لمس—
مگر صبح اٹھتے تو خشکی غائب،
اور ہم پھر سے گراؤنڈ جانے کو تیار ہوتے۔
چند دن پہلے میرے بڑے بھائی فیصل آئے۔
ایک عجیب سا لمحہ آن ٹھہرا— میں ان سے
گلے لگنا چاہتا تھا۔
ایک شام وہ اپنے کمرے کی ترتیب کر رہے
تھے، کیونکہ حال ہی میں دیواری الماری
بنوائی گئی تھی۔ اتفاق سے میں اس وقت امی
کے ہاں تھا۔ میں نے بھی ارادہ کر رکھا تھا کہ
یہاں دیواری الماری بنواؤں گا۔
کچھ لکڑیاں بچ گئی تھیں۔
میری بڑی بھابھی— جنہیں میں ہمیشہ "آپی"
کہتا ہوں— اپنے میکے جانے والی تھیں،
تو بھائی نے نیچے سے آواز دی: "یار اویس،
یہ لکڑی کے ٹکڑے کہاں رکھوں؟"
میں نے کہا: "بھائی، جہاں مناسب سمجھیں۔"
بھائی بے ساختہ بولے: "پھر تمہارے
کمرے میں ہی رکھ دیتا ہوں۔"
یہ سن کر میں خاموش ہو گیا۔
اپنے کمرے کے احساس میں ڈوب گیا۔
دل ہی دل میں عجیب سی خوشی جاگی۔
شادی کے بعد میں اور صالحہ اسی کمرے میں رہ کرتے تھے۔
بھائی نے آج بھی اسے ہمارا کمرہ ہی سمجھا۔
حالانکہ اب وہاں بہت سی تبدیلیاں آ چکی ہیں،
مگر میں جب بھی وہاں جاتا ہوں،
واپس آ کر صالحہ سے ضرور کہتا ہوں: "آج
میں اپنے کمرے میں گیا تھا۔"
آخری بار جب ہم بھائی کے ہاں دعوت پر تھے،
تو اپنے کمرے میں بھی گئے۔
واپس آ کر صالحہ کچھ اداس سی ہو گئی اور بولی: "اب
اس کمرے میں ہماری کوئی یاد ہی نہیں رہی۔"
میں خاموش ہو گیا۔
اسے کیا بتاؤں
کہ اس گھر کے در و دیوار کو یاد کرنے کے
لیے مجھے کسی نشانی کی ضرورت نہیں۔
وہ احساس تو میری روح میں بسا ہوا ہے۔
وہ احساس
جو اویس کو مرتے دم تک اپنے سحر میں
جکڑے رکھے گا؛
وہی احساس
جو نوزائیدہ بچے کو ماں کے سینے سے لگتے ہی
میسر آتا ہے؛
وہی احساس
جو تپتے صحرا میں بھٹکتے مسافر کو راستہ ملنے پر
نصیب ہوتا ہے۔
اور وہی احساس
جو میں ہر شام اپنے ماں باپ کے پاس جا کر پا لیتا ہوں۔

☆☆☆☆☆

غٹرغوں

ہمارے ہاں شور کی کمی کبھی نہیں رہی، البتہ معنی اکثر ناپید رہے ہیں۔ ہر طرف آوازیں ہیں۔ چیخیں، تقریریں، بیانات، ٹاک شوز، اسٹیٹس___ مگر اگر کان لگا کر سنا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب ایک ہی جگہ سے اُٹھ رہا ہے: غٹر سے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے بدبو آتی تھی، اب دلیل آتی ہے۔

ہم ایک ایسے معاشرے میں رہتے ہیں جہاں غٹر ڈھکا ہو یا کھلا، غوں غوں مسلسل جاری رہتی ہے۔ محلے کی نالی بند ہو تو سب انجینئر بن جاتے ہیں، اور ملک بند ہو تو سب دانشور۔ جس کے ہاتھ میں موبائل آ جائے وہ خود کو قوم کا فکری ٹھیکیدار سمجھنے لگتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ یہاں ہر شخص کے پاس حل ہے، مسئلہ صرف یہ ہے کہ کسی کو مسئلہ سمجھ نہیں آتا۔

غٹر کی خاص بات یہ ہے کہ وہ ہمیشہ نیچے ہوتا ہے، مگر ہماری گفتگو ہمیشہ اوپر سے آتی ہے۔ ہم اونچی آواز میں بات کرتے ہیں تاکہ کمزور دلیل دب جائے۔ دلیل اگر پھر بھی سانس لے لے تو اس پر لیبل چپکا دیا جاتا ہے۔ یہی تو ہماری فکری صفائی کا نظام ہے: سوال کو گالی سے دھو دو

سوشل میڈیا اس غٹر کا جدید ڈھکن ہے۔ اوپر تصویریں چمکتی ہیں، نیچے خیالات سڑتے ہیں۔ ایک صاحب روز لکھتے ہیں:

''میں سیاست پر بات نہیں کرتا''

اور اگلی دس پوسٹیں سیاست ہی پر ہوتی ہیں۔ فرق صرف اتنا کہ اب اسے ''قوم کی فکر'' کہا جاتا ہے۔

ہمیں ہر بات پر رائے دینا لازم معلوم ہوتا ہے چاہے علم صفر ہو۔ کیوں کہ خاموشی ہمارے نزدیک کمزوری ہے، اور لاعلمی مان لینا تو جیسے قومی غداری۔ اس لیے ہم بولتے رہتے ہیں، غوں غوں، حتیٰ کہ اصل بات ڈوب جاتی ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے غٹر میں کبھی کوئی قیمتی چیز گر جائے تو وہ بدبو میں گم ہو جاتی ہے۔

سرکاری دفتر جائیں تو فائلوں سے پہلے آوازیں ملتی ہیں۔ ''کل آئیے''، ''اوپر سے آرڈر نہیں''، ''ہم کیا کر سکتے ہیں''۔ یہ سب غٹر غوں کی سرکاری شکلیں ہیں۔ نظام سڑا ہوا ہو تو الفاظ بھی بدبودار ہو جاتے ہیں، بس فرق یہ ہے کہ انہیں سننے کی عادت ڈال لی جاتی ہے۔

اصل مسئلہ غٹر نہیں، غٹر سے انکار ہے۔ ہم ماننے کو تیار نہیں کہ بدبو ہماری اپنی ہے۔ ہم ہمیشہ نالی کسی اور کے دروازے کے سامنے کھلی دیکھنا چاہتے ہیں۔ خود احتسابی؟ وہ تو صرف تقریروں میں اچھی لگتی ہے، عملی زندگی میں تو ہمیں صرف مائیک چاہیے۔

یہ مضمون کسی کے خلاف نہیں، سب کے لیے ہے۔ خاص طور پر میرے اور آپ کے لیے۔ کیوں کہ اگر ہمیں یہ سب پڑھ کر ہنسی آ رہی ہے تو ذرا رک کر سوچیے۔ کہیں یہ ہنسی بھی غٹر غوں کا حصہ تو نہیں؟

☆☆☆☆☆

نعمان منظور

پلاسٹک کا تاج

شاہدہ دلاور شاہ

شہر کے عین بیچوں بیچ کھڑی وہ عمارت دور سے دیکھنے میں بڑی باوقار لگتی تھی۔

سرخ اینٹوں کی دیواریں، لمبی کھڑکیاں، داخلی دروازے پر زنگ آلود مگر باوقار سا بورڈ — جیسے کسی زمانے میں یہاں علم رہتا ہو، وقار رہتا ہو، اصول رہتے ہوں۔

مگر قریب جا کر معلوم ہوتا کہ عمارت کی جلد سلامت ہے، اندر سے ہڈیاں کھوکھلی۔

پلستر جگہ جگہ جھڑ رہا تھا۔

سیڑھیوں کے کونے نمی سے پھولے ہوئے تھے۔

فائلوں کی بو، پسینے کی بو، پرانے کاغذ کی بو — سب مل کر ایک ایسی فضا بناتے تھے جس میں وقت بھی کھانس کھانس کر چلتا تھا۔

یہی وہ ادارہ تھا جہاں کبھی فراز کمال نے بطور طالب علم داخلہ لیا تھا۔

اگر آپ پرانے رجسٹر نکال کر دیکھیں تو اس کا نام کہیں آخری صفحات میں مل جائے گا — مدھم سیاہی سے لکھا ہوا، جیسے کسی نے مجبوری میں درج کیا ہو۔

وہ کبھی نمایاں طالب علم نہیں رہا۔

نہ ذہین، نہ محنتی، نہ باصلاحیت۔

وہ ان لڑکوں میں سے تھا جو کلاس میں سب سے پیچھے بیٹھتے ہیں، امتحان میں نقل ڈھونڈتے ہیں، اور نتیجے کے بعد قسمت کو

گالی دیتے ہیں۔

اسے آج تک یاد نہیں تھا کہ اس نے کیا پڑھا تھا۔

معاشیات یا تاریخ؟

سوشیالوجی یا سیاسیات؟

اس کے لیے سب مضامین ایک جیسے تھے:

محض پرچے پاس کرنے کی رکاوٹیں۔

مگر اس کے اندر ایک عجیب صلاحیت تھی—

جھکنے کی صلاحیت۔

وہ ہر طاقت ور کے سامنے ایسے جھکتا جیسے گھاس ہوا کے آگے جھکتی ہے۔

اور پھر موقع ملتے ہی اسی گھاس میں سانپ بن جاتا۔

طالب علمی کے زمانے میں بھی وہ اساتذہ کی خوشامد کرتا، چھوٹے موٹے کام کر دیتا، خبریں پہنچاتا، اور بدلے میں رعایتیں لیتا۔

لوگ اسے ''مکھن باز'' کہتے تھے۔

وہ مسکرا کر کہتا

''دنیا مکھن سے چلتی ہے، اصولوں سے نہیں۔''

وقت گزرتا گیا۔

وہ اوسط نمبروں کے ساتھ فارغ التحصیل ہوا۔

پھر کچھ عرصہ ادھر ادھر کی چھوٹی نوکریاں۔

پھر بے روزگاری۔

پھر سفارشوں کی تلاش۔

اور پھر ایک دن — جیسے کسی نے اندھیرے میں تیر مارا ہو — وہ اسی ادارے میں عارضی کلرک بھرتی ہو گیا۔

کسی کو یاد بھی نہ تھا کہ یہ کبھی یہاں پڑھتا تھا۔

وہ فائلیں اٹھاتا، دستخط کرواتا، چائے منگواتا، اور خاموشی سے سب کے راز جمع کرتا رہتا۔

وہ کام کم، مشاہدہ زیادہ کرتا تھا۔

کس افسر کی کمزوری کیا ہے۔

کس کو تعریف پسند ہے۔

کس کو تحفہ۔

کس کو خوشامد۔

وہ لوگوں کو نہیں، ان کی خواہشات کو پڑھتا تھا۔

اور یہی اس کی اصل ڈگری تھی۔

پھر ایک دن حادثہ ہوا۔

اوپر کی بڑی سیٹ خالی ہو گئی۔

ڈائریکٹر معطل۔

انکوائری جاری۔

فائلیں الجھی ہوئیں۔

عارضی تقرری کے لیے کسی ''وفادار'' آدمی کی ضرورت تھی۔

وفادار — یعنی ایسا شخص جو سوال نہ کرے۔

اور یوں، ایک دفتری غلطی، ایک فون کال، ایک خفیہ سفارش...

نام نکلا: فراز کمال۔

جب حکم نامہ آیا تو سب حیران تھے۔

"یہ؟"

"یہ کیسے؟"

"یہ کب سے قابل ہو گیا؟"

مگر حکم نامے دلیلوں سے بڑے ہوتے ہیں۔

اگلے دن وہ اسی عمارت میں داخل ہوا، مگر

قدموں میں عجیب غرور تھا۔

جیسے زمین اس کی ملکیت ہو۔

کرسی پر بیٹھتے ہی اس نے کمرہ بدلوا دیا۔

نیا صوفہ۔

نیا پردہ۔

نئی تختی

چیف ایگزیکٹو آفیسر — فراز کمال

اس نے آئینے میں خود کو دیکھا اور مسکرایا۔

پہلی بار اسے اپنا عکس اچھا لگا۔

"میں بنا ہوں حکومت کے لیے۔"

یہ جملہ اس نے خود سے کہا۔

اور اسی دن سے ادارہ آہستہ آہستہ دفتر کم،

خاندانی بیٹھک زیادہ بننے لگا۔

سب سے پہلے بھائی آیا۔

پھر کزن۔

پھر سالا۔

پھر بھانجا۔

پھر بیوی۔

ہر ایک کے لیے نیا عہدہ تخلیق ہوا۔

عجیب عہدے۔

"اسپیشل کوآرڈینیٹر"

"ایڈوائزری افسر"

"ٹیکنیکل سپورٹ ہیڈ"

کام کسی کو نہیں آتا تھا، مگر تنخواہ سب کو ملتی تھی۔

چند مہینوں میں پورا اسٹاف اس کا قبیلہ بن گیا۔

جو قابل تھے، حاشیے پر چلے گئے۔

جو رشتہ دار تھے، مرکز میں آ گئے۔

میرٹ اب محض ایک لفظ تھا — جیسے پرانی لغت میں پڑا کوئی متروک لفظ۔

فراز اب بدل چکا تھا۔

اس کی چال میں اکڑ تھی۔

آواز میں حکم۔

آنکھوں میں مصنوعی چمک۔

وہ اکثر کہتا:

"میں سسٹم نہیں مانتا۔ میں خود سسٹم ہوں۔"

میٹنگز میں لمبی تقریریں کرتا۔

انگریزی کے ٹوٹے پھوٹے جملے بولتا۔

کارپوریٹ لہجہ اپناتا

ایک دن ہنستے ہوئے بولا:

"میں اس ادارے کا ٹرمپ ہوں... میں ڈیل کرتا ہوں، رول نہیں پڑھتا۔"

لوگ خاموش رہے۔

کیونکہ ہنسی اب خطرناک ہو چکی تھی۔

مگر عمارت خاموش نہ تھی۔

دیواروں میں دراڑیں بڑھنے لگیں۔

کام رکنے لگا۔
طلبہ پریشان۔
اساتذہ مایوس۔
فائلیں گم۔
بدعنوانی معمول۔
مگر فراز کے کمرے میں خوشبو، قالین اور اے سی چلتا تھا۔
وہ پلاسٹک کا تاج پہنے بیٹھا تھا — چمکدار مگر نقلی۔
وہ ہر شام آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر خود کو دیکھتا اور کہتا:
''لوگ مجھے یاد رکھیں گے۔''
حالانکہ لوگ اسے پہلے ہی بھول چکے تھے۔
پھر آڈٹ آیا۔
خاموش، بے آواز، کاغذی آڈٹ۔
اور سب کچھ کھل گیا۔
جعلی تقرریاں۔
خاندانی تنخواہیں۔
فرضی بل۔
غائب ریکارڈ۔
اس کی سلطنت ریت کی طرح بہنے لگی۔
اوپر والوں نے ہاتھ کھینچ لیا۔
فون بند۔
دروازے بند۔
تعریفیں بند۔
پہلی بار اسے معلوم ہوا کہ خوشامد کا کوئی مستقل رشتہ نہیں ہوتا۔
جس دن فائدہ ختم، اسی دن محبت ختم۔
جب اسے دفتر خالی کرنے کا حکم ملا تو وہ دیر تک کرسی کو دیکھتا رہا۔
یہ وہی کرسی تھی جسے وہ تخت سمجھ بیٹھا تھا۔
چوکیدار نے اس کا سامان باہر رکھا۔
کوئی ملازم الوداع کہنے نہ آیا۔
کوئی آنکھ نم نہ ہوئی۔
وہ عمارت سے باہر نکلا تو شام ہو چکی تھی۔
بورڈ پر نئی تختی لگ رہی تھی۔
اس کا نام ہٹا دیا گیا تھا۔
جیسے وہ کبھی تھا ہی نہیں۔
اس کے بھانجے اور بھتیجے اور دیگر رشتے دار کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔
اگر کہیں تھے بھی تو ان کے ہاں بھی اس کے کاندھوں پر بہت جمع خرچ نکلتے تھے---
شکوے ہی شکوے---!
اس نے آخری بار پیچھے مڑ کر دیکھا۔
عمارت ویسی ہی تھی۔
صرف تاج گر چکا تھا۔
اور اسے پہلی بار احساس ہوا—
وہ کبھی بادشاہ تھا ہی نہیں۔
بس
پلاسٹک کا تاج
گرمی میں پگھل گیا تھا۔

☆☆☆☆☆

افسانہ قدیم محبت جدید انسان

عائشہ احمد جاوید

اور اگلی گاڑی یا سواری
پیار و یار کچھ نہیں بس دلوں کو پرچانے کے سودے ہیں۔
لگ گیا تو ٹھیک ہے ورنہ یہی نصیب میں تھا۔
اپنی ہر ناکامی اور مایوسی کا الزام نصیب پر
اپنی ہر کامیابی اور فتح کا انحصار کا ایوارڈ خود اپنی ذات پر واہ اے انسان کتنا خود غرض ہے؟
رو رو کر اب زوہیب کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

سن رہی ہو ناں زوہیہ
یار اتنی جلدی کیوں چلی گئی؟
اتنا چاہا تھا میں نے تمھیں یار ابھی تو ہماری کہانی شروع ہوئی تھی۔ یہ کیا ہو گیا ہے۔
مجھے بھی بس بلوا لو ناں۔
دل کا بوجھ ہلکا ہوا تو سورج کی کرنیں بتا رہی تھیں کہ اب اُٹھا جائے۔
مشکل سے وجود کو اٹھا کر زوہیب قبرستان سے باہر نکلا اور گاڑی کی طرف بڑھا۔
باہر آیا تو سامنے روشین کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ زبان کو چپ لگ گئی۔
اور ادھر روشین زوہیب کو دیکھ کر سکتے میں آ گئی۔
دونوں ایک دم سے بولے۔

زوہیب تم یہاں کیا کر رہے ہو اور کیسے ہو.....؟
روشین کی آواز بہت بوکھلائی ہوئی تھی۔
زوہیب نے لہجے کو تو سنبھالا اور کہا۔
میں یہاں زوبیہ کے پاس آیا ہوں اور رونے لگا۔
کیا مطلب زوبیہ.....؟
روشین کی تو چیخ نکل گئی۔
کہاں ہے زوبیہ بولو زوبیہ کہاں ہے
زوہیب زوبیہ تو فوت ہوگئی ہے ایکسیڈنٹ میں اور دو ماہ ہو گئے ہیں۔ اور روشین نے سکتے کی حالت میں زوہیب کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
زوہیب صبر کرو.....
آؤ مجھے بھی لے چلو۔
میں یہاں بابا کی قبر پر آئی تھی۔
آؤ۔ اور دونوں نے وہاں فاتحہ پڑھی، جو دونوں کا رونا تھم ہی نہیں رہا تھا۔ ضبط ٹوٹ رہا تھا۔
بہرحال قبرستان سے باہر آ کر زوہیب نے روشین سے کہا
آؤ میں تمھیں ڈراپ کر دوں۔
اچھا میں میں ڈرائیور کو کال کروں۔ اسے کہا تھا کہ واپسی پر مجھے پک کرے۔ اور روشین نے کریم بخش کو کال کر کے منع کر دیا۔ میں آ رہی ہوں تم مت آنا۔ OK جی میڈیم۔
اور زوہیب کے ساتھ بیٹھ گئی۔
کیسی ہو روشی؟
ٹھیک ہوں۔
ایک گہری لمبی سانس لی۔
ابرار کہاں ہے؟ وہ ساتھ نہیں آیا۔
نہیں اور روشین چپ ہوگئی۔ تم بتاؤ یہ سب کیسے ہوا۔؟
اور تم نے مجھے بتایا نہیں کہ یہ سب ہوگیا۔ زوہیب بتاتا تھا مگر اتنی ہوش کہاں تھی میرے پاس تمھارا نمبر مس پلیس ہوگیا تھا۔
اور سارے رستے خاموش رہی اور آخرکار گھر آ گیا۔
اور زوہیب نے نمبر لے لیا۔ میں شام کو بات کروں گا۔ ضرور
وقت گزرتا گیا شامیں ڈھلتی گئیں۔ دن نکھرتے گئے۔ ابرار کے فون کالز آنے لگتے مزاج میں وقت کے ساتھ ساتھ اداسی اور غم نمایاں ہوگئے۔
Miss You کے بجائے کب آ رہی ہو کا Massege ہوا۔
فون پر سلام خیریت موسم کی باتیں ہوتیں نہ اسکورنج ہوتا نہ مجھے ملال ہوتا یہ عجیب سی چاہت تھی مگر خاموش ایک نظر کرم تھی مگر ادھوری.....
مہندی رنگ چوڑیاں سب ہی خاموش اور

اداس تھے۔ محبت سوالیہ تھی اور میں گہری
خاموش۔ ایک عرصہ ابرار سے لاتعلق اور
بے پرواہی۔
وہ مجھے لاتعلق ہا مگر بے پروا نہیں رہا......
رابطہ رکھتا تھا۔
جب تک ہم اس امر کو نہ سمجھ جائیں کہ ہم کس
قسم کی محبت کرتے ہیں اور اس کی مدت کیا
ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو وقت دے
رہے ہیں، جو اس بات کا صحیح حل ڈھونڈے
گا وہی سکندر ہوگا۔ کیوں کہ وقت کے ساتھ
بوریت میں اور بوجھ میں افاقہ ہو رہا تھا اور
ہم بیزار ہو رہے تھے۔
صبح فجر کی نماز پڑھ کر میں واک پر نکل گئی۔
امی نماز پڑھ رہی تھیں۔
کچھ دیر ہی گزری تھی کہ اچانک میرا موڈ
بدل گیا۔
اُٹھو اُٹھو ابرار اذان ہو گئی ہے۔ نماز پڑھو۔
اچھا ناں اُٹھتا ہوں - ابرار صاحب
بڑبڑائے دادا تمھارے امام مسجد تھے۔ اور
پوتے کا یہ حال ہے۔
میں نے باتوں کا تیر چلایا۔
اوہو ایک تو تم صبح صبح شروع ہو جاتی ہو۔
خاندانی طعنے دیتے ہوئے بدلحاظ ہو
جاتی ہو۔
تمھیں پتہ تو ہے اُٹھتے ہوئے ذرا سی دیر ہو
جاتی ہے۔
پھر میں بیوی کی اس طرح کی باتوں کا عادی
ہو جاتا ہو نظر اُتر جاتی ہے۔
اچھا......
ایک مجھے چھوڑ کر کون فدا ہے جناب پر؟
تمھیں چھوڑ کر کیوں تم ہی تو ہو......
اوہو......اُٹھو
اور نماز پڑھ کر ابرار صاحب میرے ساتھ
مارننگ واک پر چلے جاتے۔
آنکھوں سے لے کر باتوں تک تعریف کے
پل باندھ دیتے
ہاہاہا......
اور ہر موڑ ہر موقع پر ایک یہ بات ہوتی۔
بڑی مشکل سے ملی ہو تم
اور زندگی کو بہت آسان کر دیا ہے تم نے
اوہو۔ کہاں کھو گئی ہو۔
اچانک زوہیب مجھ سے مخاطب ہوا۔
کہیں نہیں۔؟
اور میں نے آنسو اپنی آنکھوں میں چھپا لیے۔
کیا حال ہے......؟
زوہیب نے سنجیدگی سے پوچھا۔
ٹھیک ہوں۔ میں نے سرسری سا جواب دیا۔
ٹھیک تو نہیں ہو۔ کوئی تو بات ہوئی ہے
آپ کی ابرار سے......
بات مطلب میں نے سوال کیا

مطلب یہ ہے کہ وہ پروانہ اپنی شمع کے بغیر نظر نہیں آ رہا۔ تشویش تو ہوتی ہے۔
اب ایسی بات بھی نہیں ہے۔
انسان کی خود اپنی بھی تو لائف ہوتی ہے۔
ہیں ہیں کیا مطلب لائف
اس کی لائف تو تم ہو، جس کے لیے اپنی لائف مشکل میں ڈالی
تم باز نہیں آؤ گے
نہیں تم باز آئی ہو۔
کس بات سے میں ایک دم سے غصے میں آ گئی۔
باتیں چھپانے سے اور دھیرے سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ دیکھو بچپن سے اب تک ہم ساتھ ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ نصیب جدا ہیں۔
اوہو۔ مذاق کر رہا ہوں اس بہانے تم ہنسی تو ہو
بتاؤ کیا ہوا ہے روشی.....؟
زوہیب نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا
کچھ نہیں کچھ بھی نہیں ہوا
واقعی۔ اگر ایسی بات ہے تو ابرار کو فون کرو
ہاں کروں گی مگر اس وقت وہ آرام کر رہا ہوگا۔
پھر جھوٹ۔ ہم دونوں جانتے ہیں کہ وہ بھی صبح مارننگ واک پر ہوتا ہے۔
چھوڑو ناں زوہیب تم اس بات کو۔
اوکے ایک وعدہ کرو تم مجھے سب کچھ نہیں مگر اتنا بتاؤ گی جس سے تم یہاں اور وہ وہاں ہے۔ اوکے وعدہ۔ زوہیب
اوہ میں نے جان چھڑائی
ٹھیک ہے آج کا ڈنر میرے ساتھ ڈن
ہاں میں نے اس لیے کی کہ اس سے زوبیہ کی بھی کچھ باتیں کروں
گھر پہنچی تو اماں کی ڈانٹ الگ۔ تم نے اتنی دیر کر دی۔ کب سے تمھارا فون بج رہا ہے۔
ابرار کالز کر رہا ہے۔
فون کہاں ہے تمھارا۔؟
کیا ہوا خیریت امی؟
پتہ نہیں کہہ رہا ہے کہ تم سے بات کرنی ہے
اچھا اور میں کمرے کی طرف لپکی اور نمبر ڈائل کیا۔
ہیلو۔ السلام علیکم
وعلیکم السلام۔ کیا ہوا سب خیریت ابرار
ہاں ہاں سب خیریت ہے تمھاری بہت یاد آ رہی تھی۔
واقعی۔ اور میری آواز میں درد سا ابھر آیا۔
روشی۔ کیا ہوا تم ٹھیک ہو ناں۔
ہاں ٹھیک ہوں۔
اور کافی دیر بات کرتی رہی۔
اچھا میں کل اسلام آباد جا رہا ہوں ایک ہفتے کے لیے۔
خیریت ہے۔ میں حیران رہ گئی۔

ہاں ہاں بس ایک آفس کا کام ہے۔
او کے۔ میں نے روکھی آواز میں کہا۔
واپسی پر تم سے ملوں گا۔
اپنا بہت سا خیال رکھنا۔
ابھی ٹائم نہیں ہے آفس جانا ہے۔
See you socn
ok-u-to اور فون رکھ دیا۔
ناشتہ کیا۔
اور اماں نے میری پسند کی بریانی بنوائی۔
میں ٹی وی دیکھنے لگی۔
ادھر آؤ روشی میرے پاس۔
جی اور میں نے ان کی گود میں سر رکھ لیا۔
خیر ہے.....
ابرار سے ناراض ہو۔
لو جی اب میں ابرار سے ناراض ہو کر آئی ہو۔
آپ کی یاد آ رہی تھی تو اس لیے آئی ہو۔
اگر تمھیں میری یاد آ رہی تھی تو تم میرے پاس اتنا تو بیٹھی نہیں ہو۔ کمرے میں بند رہتی ہو۔
کھانا کھاتی ہو سو جاتی ہو۔
ایسا ہوتا ہے کیا اپنی ماں کے ساتھ اور میری امی رونے لگی۔
ناں ماں
پلیز مت روئیں
اور میں بھی رونے لگی۔

اسی اثنا میں ایک گہری خاموشی طاری ہو گئی۔
کیا ہوا گڑیا.....؟
کیا ہوا بتاؤ میں تمھاری ماں بھی ہوں اور دوست بھی ایسی بھی کیا بات ہے۔
بس میں اچھی بیٹی نہیں ہوں.....؟
نہیں ایسی بات نہیں ہے تم جان ہو ہماری میرے بچے۔
بس اسی بات سے تو جان نکلتی ہے میری کہ میں نے آپ کی پسند کے خلاف شادی کر لی۔ آپ زوہیب سے میری شادی کروانا چاہتی تھی اور میں نے ابرار سے شادی کر لی۔
بیٹا ابرار میں کوئی کمی تو نہیں ہے۔ بس اپنی اپنی پسند کی بات ہوتی ہے، جو نصیب میں ہوتا ہے وہی ہوتا ہے۔ اور میں بہت خوش ہوں۔ میں تمھارے لیے ابرار کے لیے بہت خوش ہوں۔
پر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، تو معاملات صاف ہوتے جاتے ہیں۔
پھر زندگی تو تم دونوں نے ہی گزارنی ہے۔
مگر آپ نے تو بہت غصہ کیا تھا ہماری شادی پر.....
بیٹے وہ اس وقت کی بات تھی۔
اب وہ ہمارا داماد ہے اور مجھے خوشی ہے بس تم بھی راضی ہو اس لیے پرانی باتیں

بھول جاؤ۔

تمھارے بابا کے جانے کے بعد اب میرا کون ہے تم دونوں کے سوا؟

اس لیے اپنے شوہر کو خوش رکھو اور اس سے راضی رہو۔

میں تم سے راضی ہوں۔

واقعی مما۔

اور میں نے اپنی والدہ کو گلے لگا لیا۔

اور دیر تک گود میں سر رکھ کر سوئی رہی۔

مگر ابھی تک ہمارے درمیان کا مسئلہ حل نہ ہوا تھا۔ بعض اوقات کچھ معاملات وقت پر چھوڑ دینے چاہئیں۔

شام کو زوہیب کی کال آئی اور ہم دونوں ڈنر پر چلے گئے۔

کھانا کھایا۔ مگر اصل مدعے پر میں نے اس کو آنے نہیں دیا۔

زوہیب کی عادت سے میں اچھی طرح واقف ہوں یونیورسٹی سے لے کر اب تک ہم ساتھ ہیں۔

بات نکلوانا اس کے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔

اور میں نے بھی ہتھیار ڈال دینے مناسب سمجھے کیوں کہ اب میں والدہ کی طرف سے مطمئن تھی۔ شروع سے ہم چار دوست تھے۔

میں، ابرار، زوہیب، زوبیہ

اس لیے ہمیں ایک دوسرے کی فطرت کا بھی اندازہ تھا۔

زوہیب ہمیں لگتا ہے کہ ہماری محبت جیت گئی مگر ہم ہار گئے ہیں خود کو.....

ہم میں کوئی کشش جذبہ احساس اب زندہ نہیں ہے۔

شاید ہماری محبت کی مدت مکمل ہو گئی ہے۔

ساتھ رہتے مگر بیزار اور روٹین لائف چل رہی ہے۔

محبت ہوئی لڑ کر شادی کی - شادی ہوئی۔

شروع شروع میں سب اچھا تھا۔ سب صحیح چل رہا تھا۔

ہاں کبھی ایسا لگتا تھا کہ میری امی خوش نہیں تھیں شاید اس لیے میں اداس ہوں جب ہماری زندگی میں جمود آ جاتا تھا۔

اور ابرار کو ایسا لگتا تھا کہ اس نے اپنی کزن ثانیہ سے شادی نہیں کی اس لیے خوش نہیں ہے۔

سب کچھ ہے ہمارے پاس الحمدللہ

مگر ہم دونوں موجود نہیں ہیں۔

دور ایسا آ گیا ہے۔ وقت سے پہلے سب کچھ سمجھدار ہو گئے ہیں۔ شاید۔

سب کچھ پا لیا اس لیے کشش ختم۔

اور میں نے اپنی لمبی کہانی کے بعد گہری سانس لی۔

ماں باپ کے سایے کے بغیر اولاد بغیر

چھاؤں کے ہوتی ہے
اور شوہر کے ساتھ کے بغیر بیوی ریت کی دیوار جیسے۔
نامناسب حالات گرا سکتے ہیں۔
ایسے جیسے کسی نے خالی میدان میں چھوڑ دیا ہو۔
ایسے کہ جیسے کسی نے سانس ہی بند کر لی ہو۔
ایسا شوہر جو دل کے قریب ہو۔
جو روح کا دوست ہو۔
وہ شوہر تو شوہر ہوتا ہی ہے۔
اور وہ شوہر ہے اسی بات پر وہ Sure بھی ہوتا ہے۔
صرف کاغذی کارروائی نہیں کی فرائض بھی ادا کیے ہیں۔
آواز کی مضبوطی
لہجے کی گرفت
دور وقت کی گردش
بھی اس بات پر عیاں ہیں
کہ یہ میرا شوہر ہے۔
میری باتیں سنتے سنتے وقت جیسے رک سا گیا ہو۔ ایک دم سے کہ دھڑم سے صوفے پر آن گرا ہو۔
ابرار سچ میں سچ کہہ رہی ہوں۔
ہاں میں.....
ہاں میں بھی میں بھی کہہ رہا ہوں کہ تم سچ کہہ رہی ہو۔
اور پاس رکھا ہوا گلاس اُٹھا کر پانی پینے لگا۔
اچانک میری طرف گلاس بڑھاتے ہوئے بولا روشین پانی پی لو۔
اور میرا ہاتھ پکڑ کر گلاس میں تھماتے ہوئے بولا ہاں پانی
اور میری سانس جیسے رک سی گئی تھی۔
تم نہیں پیو گئے۔
میری پیاس اب بجھ گئی ہے۔ اور ابرار دم بخود سا ہو گیا۔
بمشکل کہہ پایا لیڈیز فرسٹ
سونا جاگنا اُٹھنا بیٹھنا سب کچھ
رنگ خوشبو ذائقے سیریں خریداری ہماری۔
ہاں ہاں میں سن رہا ہوں۔
اور ابرار کی آنکھیں بھیگ گئیں
اور روشین نے بھی نہیں روکا۔
مگر اس نے جب مجھ سے کہا کہ تم مجھ سے شادی کر لیتی۔ روشی۔
کس نے زوہیب نے.....؟
ابرار نے تجسس سے پوچھا۔
ہاں ہاں
اور وہ ایک غمگین بچے کی طرح پورا سبق سنا رہی تھی۔
جس پر جملے کی اختتام پر چار لفظ یاد کروانے پڑتے تھے۔
تو میں نے کہا شادی تو کر لی ہے۔

infact شادی ہی تو کر لی ہے میں نے
اور اپنی پسند کی بھی کی ہے۔ خوش ہوں
مطمئن ہوں حاصل ہو گیا سب کچھ دلی مراد
مگر، ہوں اس کے ساتھ اس کا پتہ نہیں؟
اس سفر کے لیے نکلی تھی۔
یہ 2025 کا وقت ہے۔
Love Marriege میں Love اور
Marrlege کی مدت کے بعد اب تو
کوئی سطحی سی اپنی وجہ رہ گئی ہے۔
کہ میں محبوب کی گرفت میں رہوں وہ میری
گرفت میں رہے۔
اور اولاد.....
اور اولاد.....
ابرار نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔
ہاں نے کہا اولاد
I mean پنچرل سی بات ہے۔
Family Mean ہوتی ہے ہو جائے گی۔
But its not a solied reason for being us together For a Lovly relation تم نے ایسے کہہ دیا۔ ابرار نے
مجھے غور سے دیکھا ہاں بابا۔ کہہ دیا۔
ابرار یہ تو Common ہے ناں
Inshallah آمین
اچھا جی۔ اور گہری سانس لی۔

مطلب ہم ایک ہوں
اور ایک ہمارے جیسا ہو یا پھر تمھارے جیسا
ہاہاہا
Come-on روشین
اور ابرار کی بری طرح ہنسی نکل گئی۔
be Serias ہاں ہاں میں سن رہا ہوں۔
اور آج تو میں بہت کچھ سن رہا ہوں اور سمجھ
بھی رہا ہوں کہ روشین کی بات
اور ہاتھوں میں گرفت آ گئی۔ پھر
ابرار نے میرے چہرے کو اپنی طرف موڑ کر
پوچھا
پھر روشی
پھر یہ کہ آواز بھی جیسے رک گئی۔
جیسے صدیوں کا فاصلہ طے ہو رہا ہو۔
جگہ بہت عزیز ہوتی ہے۔
ابرار
دل میں گھر میں زندگی میں
جگہ بنانے کا ارمان نہیں
جیسے آپ کو جگہ دینے کا اعزاز حاصل ہے۔
اور اعزاز تمغے اقتدار تخت جس پر یک ایسی
شہزادی بیٹھی اس سلطنت پر حکمرانی کرے۔
واہ
Own تو کوئی دوسرا آپ کو کر ہی لیتا ہے۔
مگر آپ کے پیار نے کیا جگہ اعزاز اور کس
لیول کا اختیار دیا ہے۔

اس کا احساس شہزادی کو ہوتا ہے۔
اور جل اس جگہ کو ہتھیانے کی کوئی چور آ جائے تو وفا کرنے کے لیے بکری بھی شیر ہو جاتی ہے۔
اور ایک حساس کمزور مرد اس شہزادی کے ہاتھوں بک جاتا ہے۔
بن مول
آواز گلے میں اٹک رہی تھی
ابرار نے ٹائی اتاری
اور
میرے قدموں میں آ بیٹھا
بتاؤ شہزادی
کیا دام لوگی.....؟
ہماری خدمت کا
جو ہم آپ کی زندگی کو خوبصورتی اور آسانی بخشیں۔
آپ کے وفا کے بول کے ساتھ
آپ کی ہنسی مسکراہٹ غصے کے ساتھ
آپ کی لاپروائی محبت کے ساتھ
آپ کی غیر حاضری یاد کی عقیدت کے ساتھ
آپ کی تنہائی ہماری چاہت کے ساتھ
آپ کے وجود ہمارے نام کے ساتھ
اور آپ مکمل خود آپ ابرار
پورے کے پورے
روشین امتیاز کے ساتھ
اور
ابرار عاطف روشین امتیاز کے ساتھ اور میں بھی
ابرار کے ساتھ بیٹھ گئی
پورے اعزاز کے ساتھ
ہاہاہا
اس لیے میں نے جلدی میں
اپنا بستر سامان امی کے گھر بھول گئی
چپل پہن کر آ گئی
موبائل بھی بھول گئی
یہ کچھ ہے ہمارے پاس ہمارے گھر میں
ابرار مسکرائے
آپ نہیں تھیں
اس لیے میں آئی ہوں ابرار
سب کچھ میرا انہیں پر ہے
عورت جتنی بھی جدید ہو
اس کی محبت اندر سے قدیم ہے اور قدیم رہے گی۔
مرد کے انداز محبت نرالے ہوں گے
خصلت روایتی رہے گی
جہاں اس میں بہتری ہو سکتی ہے
انداز کی
خیالات کی
مگر یہ سب بنیاد سے جڑے ہیں
کیونکہ وہ آدم اور حوا کی اولاد ہیں۔

☆☆☆☆☆

خالی کرسی کی نوآبادیات

سید تحسین گیلانی

اس شہر کی ہیئت بدل چکی تھی۔ عمارتیں اب اینٹ اور پتھر کی نہیں تھیں، بل کہ ایک عجیب سے جمے ہوئے دھوئیں کی مانند فضا میں معلق تھیں۔ شہر کے بیچوں بیچ ایک وسیع و عریض ہال تھا جس کی کوئی چھت نہیں تھی، بس دیواریں تھیں جو لامتناہی بلندیوں تک چلی گئی تھیں۔

ہال کے عین وسط میں ایک کرسی رکھی تھی۔ وہ کرسی کسی بھی مادی وجود سے عاری تھی، بس ایک ''خاکہ'' تھا جو روشنی کی لکیروں سے بنا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

اس کرسی کے گرد لاکھوں لوگ قطاروں میں کھڑے تھے، مگر کوئی ہلتا نہیں تھا۔ سب ساکت تھے۔ ان کے چہروں پر کوئی خدوخال نہیں تھے، جیسے کسی نے موم بتوں کو تیز دھوپ میں رکھ کر ان کے نقش پگھلا دیے ہوں۔

پہلی قطار میں کھڑے ایک ہیولے نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ جیسے ہی اس کی انگلیوں نے کرسی کے ''خالی پن'' کو چھوا، اس کا بازو

دھیرے دھیرے غائب ہونے لگے۔ وہ چیخنا چاہتا تھا، مگر اس کے گلے سے آواز کے بجائے صرف ''خالی رنگ'' نکل رہے تھے۔

''تمھاری باری اب آئی ہے،'' ایک بے سمت آواز فضا میں گونجی۔ یہ آواز کسی فرد کی نہیں تھی، بلکہ ایسا لگتا تھا جیسے خود وہ کرسی بول رہی ہو۔

''میں یہاں کیا لینے آیا ہوں؟'' ہیولے نے پوچھا۔

''تم یہاں اپنی 'کمی' پوری کرنے آئے ہو۔ اس کرسی کی نوآبادیات کا پہلا اصول یہ ہے کہ جو اس پر بیٹھنے کی تڑپ رکھتا ہے، اسے پہلے اپنا 'ہونے' کا بوجھ اس کے قدموں میں ڈھیر کرنا پڑتا ہے۔''

میں نے دیکھا (یا شاید میں نے صرف محسوس کیا) کہ وہ لوگ جو قطاروں میں تھے، وہ ایک ایک کر کے اپنی یادیں، اپنے خواب اور اپنی انفرادی لکیریں کرسی کی نذر کر رہے تھے۔ وہ جتنے زیادہ ''خالی'' ہوتے جا رہے تھے، اتنے ہی اس کرسی کے قریب پہنچ رہے تھے۔

یہ ایک ایسی عجیب و غریب نوآبادیات تھی جہاں قابض کوئی بیرونی طاقت نہیں تھی، بل کہ وہ ''خلا'' تھا جو ہر انسان کے اندر موجود ہوتا ہے۔ کرسی صرف اس خلا کا ایک مادی استعارہ تھی۔

فرش پر ہزاروں ایسی چیزیں بکھری پڑی تھیں جن کا اب کوئی مالک نہیں تھا۔ کٹی ہوئی زبانیں، جن پر ابھی تک سچائی کی کڑواہٹ باقی تھی؛ منجمد آنسو، جو ابھی گرے نہیں تھے؛ اور وہ ادھورے خیالات جو کبھی لفظ نہیں بن سکے۔

اچانک، ہال کی دیواریں سکڑنے لگیں۔ وہ کرسی، جو پہلے صرف ایک خاکہ تھی، اب ایک ''سیاہ سوراخ'' (HoleBlack) کی طرح نظر آنے لگی۔ جو بھی اس کے قریب جاتا، وہ اس میں سما جاتا اور پیچھے صرف ایک خالی جوڑا جوتے یا ایک بے نام ٹوپی رہ جاتی۔

''یہ تو خودکشی ہے،'' میں نے اپنے اندر سوچا۔

''نہیں، یہ تکمیل ہے،'' آواز نے جواب دیا۔ ''تم سب نے صدیوں تک 'اشیاء' کو پوجا ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ تم 'لاشئے' کی حاکمیت کو تسلیم کرو۔ یہ کرسی کبھی نہیں بھرے گی، کیونکہ اسے تمھارے جسموں کی نہیں، تمھارے 'عدم' کی بھوک ہے۔''

ہال اب مکمل طور پر اندھیرے میں ڈوب چکا تھا، بس وہ کرسی ایک مدھم سی نیلی روشنی کے ہالے میں چمک رہی تھی۔ قطار میں کھڑا آخری شخص جب اس میں سما گیا، تو کرسی نے ایک لمبی انگڑائی لی اور ہال کی دیواریں ٹوٹ کر بکھر گئیں۔

اب وہاں نہ شہر تھا، نہ ہال، اور نہ ہی لوگ۔ صرف ایک کرسی تھی جو کائنات کے لامتناہی سمندر میں تیر رہی تھی، مکمل طور پر خالی، اور مکمل طور پر حاکم۔

خالی کرسی کی اس لامتناہی حکمرانی میں ایک نیا موڑ تب آیا جب فضا میں ایک ''بے آواز آہٹ'' پیدا ہوئی۔

وہ کرسی جو اب تک صرف ایک خلا تھی، اچانک ایک مقناطیس کی طرح اردگرد کے بکھرے ہوئے ملبے کو سمیٹنے لگی۔ وہ کٹی ہوئی زبانیں، وہ منجمد آنسو اور وہ ادھورے خیالات جو فرش پر پڑے تھے، ایک ایک کر کے فضا میں بلند ہوئے اور کرسی کے گرد ایک حصار بنانے لگے۔

اب وہ کرسی صرف ایک خاکہ نہیں رہی تھی، بل کہ وہ ایک ''یادداشت کا قبرستان'' بنتی جا رہی تھی۔

قطار میں موجود وہ ہیولے جو اب تک خاموش تھے، اب ایک دوسرے کے قریب آنے لگے، مگر ان کے درمیان کوئی رابطہ نہیں تھا۔ وہ ایک دوسرے کے وجود سے ٹکراتے تو شیشے کے ٹوٹنے جیسی آواز آتی۔

''تم نے دیکھا؟'' کرسی سے وابستہ اس بے سمت آواز نے دوبارہ سرگوشی کی۔ ''جب مادہ ختم ہو جاتا ہے، تو صرف 'خوف' باقی رہ جاتا ہے۔ یہ نوآبادیات دراصل تمھارے اپنے خوف کی فصیل ہے۔''

اچانک ہال کی فرش پر ایک دراڑ پڑی اور وہاں سے ایک سفید لکیر نمودار ہوئی جو کرسی کی طرف بڑھنے لگی۔ یہ لکیر نہ روشنی تھی نہ رنگ، بل کہ یہ ایک ''انکار'' تھا۔ جیسے ہی وہ لکیر کرسی کے پائے سے ٹکرائی، وہ نیلی روشنی تھرتھرانے لگی۔

وہاں موجود ایک ہیولے نے، جس کا چہرہ ابھی مکمل طور پر نہیں پگھلا تھا، اپنی مٹھی کھولی۔ اس کی ہتھیلی پر ایک چھوٹا سا بیج چمک رہا تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' آواز میں پہلی بار ایک

لرزش آئی۔

''یہ ایک 'کیوں' ہے،'' ہیولے نے جواب دیا۔ اس کی آواز اتنی نحیف تھی کہ جیسے صدیوں پرانی کتاب کا ورق الٹنے کی سرسراہٹ۔

جیسے ہی اس نے وہ ''بیج'' یعنی وہ سوال کرسی کے خلا میں پھینکا، وہاں ایک دھماکہ ہوا، مگر وہ دھماکہ آواز کا نہیں، بل کہ خاموشی کے ٹوٹنے کا تھا۔ وہ تمام یادیں، زبانیں اور خواب جو کرسی نے ہڑپ کر لیے تھے، ایک فوارے کی طرح باہر نکلنے لگے۔

کرسی کی وہ نوآبادیات جو ''عدم'' پر قائم تھی، اب ''وجود'' کے بوجھ سے چٹخنے لگی۔

دیواریں جو بادلوں کی طرح معلق تھیں، اب کاغذ کی طرح پھٹنے لگیں۔ میں نے دیکھا کہ کرسی کے اس خلا کے پیچھے کوئی طاقتور حکمران نہیں تھا، بل کہ صرف ایک پرانا آئینہ تھا جو خود کو چھپانے کے لیے ''خالی'' ہونے کا ناٹک کر رہا تھا۔

''تو یہ سارا تماشہ صرف ایک عکس کا تھا؟'' میں نے پکار کر پوچھا۔

مگر جواب دینے والا کوئی نہیں تھا۔ کرسی پگھل کر ایک کالے سیاہ مائع (Liquid) میں بدل گئی جو فرش پر پھیلتا جا رہا تھا۔ وہ ہیولے جو ساکت کھڑے تھے، اب اپنے پاؤں کی آہٹ سننے لگے تھے۔ ان کے نقش واپس آ رہے تھے، مگر وہ نقش اب پہلے جیسے نہیں تھے۔ ان کے ماتھوں پر اس خالی کرسی کا ایک چھوٹا سا نشان ثبت ہو چکا تھا۔

شہر واپس تو آ گیا، مگر اب وہاں کوئی اونچی عمارت نہیں تھی، نہ کوئی ہال تھا۔ صرف ایک وسیع میدان تھا جہاں لاکھوں لوگ اپنے اپنے ہاتھوں میں اپنی اپنی چھوٹی کرسیاں اٹھائے کھڑے تھے اور ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔

نوآبادیات ختم نہیں ہوئی تھی، وہ صرف ''تقسیم'' ہو گئی تھی۔ اب ہر شخص ایک چھوٹی سی خالی کرسی کا مالک بھی تھا اور اس کا قیدی بھی۔

میں نے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ وہاں قلم کی جگہ اب ایک چھوٹی سی لکڑی کی کیل چبھ رہی تھی۔ میں نے اسے نکالنا چاہا، مگر وہ میرے گوشت کا حصہ بن چکی تھی۔

ہوا میں اب بھی وہی سوال معلق تھا:

''جب کرسی بھر جائے تو کیا انسان خالی ہو جاتا ہے؟''

☆☆☆☆☆

بصیرت

آسمان بادلوں سے سجا ہوا تھا۔ چھوٹے بڑے بادلوں کے ٹکڑے اپنے اندر ڈھیروں پانی سمیٹے، کسی بھی لمحے برسنے کو تیار تھے۔ ہوائیں جھوم جھوم کر خوش گوار موسم کی خبر دے رہی تھیں تو درختوں کے پتے بھی ان کے سنگ لہلہاتے ہوئے جیسے کوئی مدھم سا نغمہ گا رہے ہوں۔

اس سب سے بے نیاز، میں اپنی ہی سوچوں میں گم تھا۔ چہرے پر پریشانی کی تہیں جمی تھیں اور آنکھوں میں تھکن گہرے نقوش چھوڑ چکی تھی۔ آج پھر جاب کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے شام ہو گئی تھی۔ صبح سے مختلف جگہ انٹرویو دینے کے بعد جسم اور ذہن دونوں جواب دے چکے تھے، مگر اصل تھکن اس زندگی سے تھی۔ ڈیڑھ سال سے یہ تلاش یونہی جاری تھی، اور ہر نا کامی مجھے مزید ناامید کرتی جا رہی تھی۔

''زندگی کتنی خوب صورت ہے''، ایسے میں چند لمحوں کے لیے میں اپنی سوچوں کے بھنور سے نکلا تو ایک لڑکی نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ میں نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ چہرے پر دھیمی سی مسکراہٹ تھی، آنکھوں پر سیاہ چشمہ اور ہاتھ میں ایک اسٹک۔

''تمھیں... تمھیں کیسے پتا؟'' میں نے بے اختیار پوچھا۔

''کیوں، میرے لیے زندگی خوب صورت نہیں ہو سکتی کیا؟'' اس نے سوال کے جواب میں سوال کیا۔

''ہو سکتی ہے، پر کیسے؟'' میں اب بھی الجھن میں تھا۔

''دیکھو! ابھی میں یہاں بنچ پر بیٹھ رہی تھی، جب میرے ہاتھ میں موجود اسٹک بنچ سے ٹکنے کے بجائے نیچے گرنے لگی۔ تم نے فوراً اسے گرنے سے بچا لیا اور خاموشی سے میری مدد کر دی''، اس نے تفصیل سے بتایا۔

''تو اس میں زندگی خوب صورت ہونے کی بات کہاں سے آ گئی؟'' میں نے ناسمجھی سے پوچھا۔

''ارے بدھو! تم جیسے لوگوں کی بدولت ہی زندگی خوب صورت ہے، جو خاموشی سے دوسروں کی مدد کرتے ہیں۔ میں دیکھ نہیں سکتی تو کیا ہوا، خدا نے میری مدد کے لیے تمھیں بھیج دیا۔ یہ بھی تو اس کا کرم ہے نا کہ اس نے زندگی میں تم جیسے اچھے لوگوں کو شامل کر کے اسے خوب صورت بنایا''، وہ جانے کیا کچھ کہہ رہی تھی، مگر میرا ذہن، مجھ

طوبیٰ صدیقی

جیسے اچھے لوگ'' اور'' خدا کا شکر'' جیسے لفظوں پر اٹک گیا تھا۔

وہ لڑکی جو بظاہر دیکھنے کی نعمت سے محروم تھی، مگر اس کے پاس وہ باطنی بصیرت موجود تھی جس سے مجھ جیسے آنکھیں رکھنے والے لوگ بھی اکثر محروم رہتے ہیں۔ میں کچھ دیر وہیں بیٹھا رہا اور وہ مسلسل بولتی رہی۔ اس کے لفظوں میں ایسی کشش تھی کہ چاہنے کے باوجود میں وہاں سے اٹھ نہ سکا۔ تقریباً تیس منٹ کی یہ ملاقات میرے لیے تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوئی۔ میں جو بوریت اور افسردگی کا شکار تھا، اس کی باتوں سے کسی حد تک ہلکا ہو گیا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ اپنی راہ چل دی، اور میں بھی اٹھ کر پارک میں یونہی ٹہلنے لگا۔ اس کے الفاظ اب بھی میرے اردگرد گردش کر رہے تھے۔

دن یونہی بے زار گزر رہے تھے۔ میں دن بھر جاب کے لیے در در بھٹکتا اور شام کو کچھ دیر سکون کی تلاش میں اسی پارک آ جاتا۔ آج بھی میں نے اسے دیکھا۔ وہ ایک چھوٹی بچی کے ساتھ خوش دلی سے باتوں میں مصروف تھی ۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کچھ زیادہ ہی باتونی ہو۔ دل میں اس کے لیے ہمدردی بھی تھی اور اس کے حوصلے کے لیے بے ساختہ احترام بھی۔

میں چلتے چلتے اس کی بنچ کے قریب جا پہنچا۔ نہ جانے اس کی شخصیت میں کیسا سحر تھا کہ میں خود بخود اس کی جانب کھنچا چلا جاتا تھا۔ وہ اپنے بچپن کا کوئی قصہ سنا رہی تھی۔ میں نے جیب سے رومال نکالا، راستے سے ملے چند گرے ہوئے پھول اس میں رکھے اور خاموشی سے اس کی بائیں جانب رکھ کر چل دیا۔

زندگی جیسے تیسے چل رہی تھی، مگر میری کوششوں میں تیزی آ گئی تھی۔ میں روز پارک آتا، اپنے اردگرد لوگوں کو ہنستے مسکراتے دیکھتا اور دل میں حسرت جاگتی کہ آخر میری زندگی میں وہ بہار کب آئے گی جب میں بھی دل سے مسکرا سکوں گا۔ اب تو یہاں آ کر بھی بے زاری سی ہونے لگی تھی۔ شاید میری سماعتیں اس بھلی سی لڑکی کی آواز کی منتظر تھیں۔

''آج کوئی تحفہ نہیں لائے؟'' اچانک میرے قریب سے نسوانی آواز سنائی دی۔

''تم... تمھیں کیسے پتا میں یہاں ہوں؟'' میں نے ٹھٹھک کر پوچھا۔

''تمھاری خوشبو سے... اب بتاؤ، کیوں پریشان ہو؟'' وہ بنچ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''میری زندگی میں کب پریشانی نہیں ہوتی؟'' میں نے بے دلی سے جواب دیا۔

''وہ کیا ہے؟'' اس کے اصرار پر میں نے سر ہاتھوں میں تھام لیا۔ دل چاہا چیخ چیخ کر سب کچھ کہہ دوں۔ ماں کی امیدیں، باپ کی توقعات، بہنوں کی نظریں... سب میری

نوکری سے جڑی تھیں۔ ان کی بجھتی آنکھیں دیکھ کر میرا دل بھی بجھ جاتا تھا۔ انہی ذمہ داریوں کے بوجھ تلے شاید میں جینا ہی بھول گیا تھا۔ نہ جانے کیوں میں نے اپنے سارے دکھ درد اس اجنبی لڑکی کو سنا دیے۔

''تم پریشان نہیں ہو، اللہ ہے نا، وہ تمھارے لیے بہترین کرے گا''، میں طنزیہ مسکرا دیا۔

''بہترین؟ پتا نہیں وہ دن آئے گا بھی یا نہیں۔ اب تو یہ زندگی جہنم لگتی ہے۔ ایسی زندگی خدا دیتا ہی کیوں ہے؟'' وہ چونک گئی۔

''چلو، میں تمھیں ایک کہانی سناتی ہوں''، اس نے کہنا شروع کیا تو میں بھی ہمہ تن گوش ہوا۔

''میں یونی ورسٹی کی گولڈ میڈلسٹ تھی۔ ہر جگہ نمایاں، ہر کام میں آگے۔ خدا نے ہر نعمت دے رکھی تھی ... میری قابلیت، میری صلاحیت مجھے میری خوش قسمتی لگتی تھیں اور آہستہ آہستہ میں اپنی صلاحیتوں پہ فخر کرتے کرتے کب غرور کی حدود میں داخل ہوئی مجھے علم ہی نہیں ہوا۔ میں اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں کے بل بوتے پر کامیابیوں کی بلندیوں کو چھونے لگی اور اپنے سے کم معیار کے لوگوں کو حقیر سمجھنے لگی۔ یہ دوسروں کو کم تر سمجھنا بھی ایک نشے جیسا ہے جس کی لت پڑ جائے تو اس چھٹکارا پانا آسان نہیں ہوتا''، اس کی آواز میں اب نمی سی تھی اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنا شاید اتنا ہی کٹھن ہوتا ہے، میں بس سوچ ہی سکا اور اس کو سنتا رہا۔ وہ بولتی گئی۔ اپنی قابلیت، غرور، اور دوسروں کو کمتر سمجھنے کی غلطی کا اعتراف کرتی گئی۔

''پھر ایک حادثہ ہوا... چند لمحوں میں سب بدل گیا۔ وہ آنکھیں جن پر مجھے ناز تھا، مجھ سے واپس لے لی گئیں۔ میں چیخی، روئی، بہت شکوے کیے''، میں اندر تک لرز گیا۔ ایک لمحے کو خود کو اس کی جگہ رکھ کر دیکھا تو بے اختیار کلمۂ شکر زبان پر آ گیا۔

''مجھے افسوس ہے...'' میں بس اتنا ہی کہہ سکا۔

''میں یہ سب ہمدردی کے لیے نہیں بتا رہی۔ میں چاہتی ہوں تم ناامید نہ ہو۔ ایک جاب ہی تو نہیں ملی، آج نہیں تو کل مل جائے گی۔ بس دینے والی ذات سے امید مت چھوڑو''، مجھے پہلی ملاقات یاد آ گئی، اور دل نے مان لیا کہ وہ بصارت سے محروم تھی، مگر بصیرت سے نہیں۔

''تم خود کو ناکام سمجھتے ہو، مگر کبھی سوچا ہے کہ شاید خدا تمھیں روک کر کچھ اور سکھا رہا ہو؟'' میں نے خاموشی سے آسمان کی طرف دیکھا۔ بادل وہی تھے، مگر اب ان میں بوجھ نہیں، ٹھنڈک تھی۔

وہ لڑکی جو دیکھ نہیں سکتی تھی، مجھے وہ سب دکھا گئی تھی جسے میں آنکھوں کے ہوتے ہوئے بھی نظر انداز کرتا آیا تھا۔

☆☆☆☆☆

ایک ہی منزل

نازاوکاڑوی

وقی (وقار نے) گھر کے اندر داخل ہوتے ہی گلے سے بستہ اُتار کر پرے پھینکا اور سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا نورین نے یوں وقی کو کمرے میں جاتے دیکھا تو سوچا بچہ ہے سکول میں کسی سے جھگڑا ہو گیا ہو گا اسی غصے میں گھر چلا آیا۔ نورین بات جاننے کے لیے وقی کے پیچھے اس کے کمرے میں چلی گئی وقی بیڈ پر اوندھے منہ لیٹا رو رہا تھا۔ نورین نے رونے کی وجہ پوچھی جواب نہ پا کر دوبارہ پوچھا کیا ہوا میرے بیٹے کو۔ کیا کسی سے جھگڑا ہو گیا ہے۔ وقی اس بار بھی نہ بولا تو وقی کو حوصلہ دیتے ہوئے کہنے لگی تو کیا ہوا جب ڈھیر سارے دوست ہوں تو کسی نہ کسی سے اختلاف تو ہو ہی جاتا ہے۔ آخر تم نے بھی تو کچھ کیا ہو گا۔ اتنی سی بات پر رویا نہیں کرتے۔ چل اُٹھ میرا بیٹا منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل لو میں تمہارے لیے کھانا گرم کرتی ہوں۔ نورین واپس جانے کے لیے مڑی تو وقی نے ڈبڈبائی آنکھیں اُٹھا کر ماں کو آواز دی۔ ماں! جی میرے بیٹے! نورین ممتا بھری محبت سے جواب دیتے ہوئے پھر وقی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

وقی نے ماں کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے سسکیوں کے درمیان پوچھا۔ ماں! میں کب تک جھوٹ بولتا رہوں۔ کیسا جھوٹ وقی۔ میں کچھ سمجھی نہیں۔ نورین وقی کے بالوں میں پیار سے اُنگلیاں پھیر رہی تھی۔ اس کے معصومانہ رونے پر پیار آ رہا تھا۔ وہ ایک دم چوکنا ہو گئی۔ ماں! آپ کو تو پتہ ہے میری ہر ماہ فیس لیٹ ہو جاتی ہے۔ کلاس میں ایک میں ہی ہوں جو سب سے آخر میں فیس ادا کرتا ہوں آج بھی ٹیچر نے بھری کلاس میں میری بے عزتی کی ہے۔ ٹیچر کہہ رہے تھے۔ اگر تمہارے ماں باپ کو اتنا ہی شوق ہے کہ ان کا بچہ اچھے سکول میں پڑھے تو فیس باقاعدگی اور وقت کے ساتھ ادا کریں۔ کیا تمہارا ہی ڈرافٹ لیٹ ہوتا ہے اور بھی تو بچے ہیں۔ جن کے باپ ہر ماہ ڈرافٹ بھیجتے ہیں۔ ایک تمہارا باپ ہے کہ ہر ماہ ڈرافٹ لیٹ اب تم ہی بتاؤ ماں۔ اپنے ساتھ اپنے باپ کی بے عزتی کیسے برداشت کروں وقی نے روتے ہوئے تمام باتیں ماں کو سنائیں جو ہر ماہ اُسے سننی پڑتی تھیں۔ نورین پر ایک دم سناٹا چھا گیا اور ٹکٹکی باندھے ننھے وقار کی طرف دیکھتی جا رہی تھی۔ اتنی چھوٹی عمر میں اتنی بڑی باتیں۔ میں تو سمجھی تھی کسی دوست سے جھگڑا ہو گیا ہے۔ ہر ماہ وہ باتیں سنتا رہا۔ اور مجھے بھی نہیں بتایا۔ اتنا صبر۔ چپ چاپ اپنے اُوپر سہے جاتا رہا۔ میں تو من ہی من میں خوش ہوتی رہتی تھی میرا بیٹا شہر کے معروف مدرسے میں تعلیم پا رہا ہے۔ اچھے دنوں کا خواب دیکھا ہے۔ وقار اس کی تعبیر بنے گا۔ کل ایک بڑا آفیسر بنے گا۔ ماشاءاللہ ذہین لڑکا ہے ابھی تک مسلسل اچھے نمبروں میں پاس ہو رہا

ہے آج اس رُوپ میں دیکھ کر میرا سر اور بھی فخر سے اُونچا ہو گیا کہ اتنی چھوٹی عمر میں اتنی پختہ سوچ کا مالک حالانکہ میں نے کبھی بھی فیس لیٹ ہونے کا سبب ڈرافٹ کی تاخیر نہیں بتایا۔

وقی جو ابھی تک ماں کے جواب کا منتظر تھا۔ ماں کو یوں حیران اور خاموش دیکھ کر بولا۔ ماں! آپ کو کیا ہو گیا ہے آپ جواب کیوں نہیں دیتیں۔ کہیں میری باتوں سے آپ کا دل تو نہیں دکھا۔ نہیں بیٹے نہیں۔ نورین نے یکدم اپنے آپ کو سنبھالا اور وقی کو زور سے گلے سے بھینچتے ہوئے پیار کیا۔ نہیں میرے لال میں تو حیران ہو گئی کہ میرا بیٹا کتنا سمجھدار ہے۔ بڑا ہو کر ضرور افسر بنے گا۔ اپنے ماں باپ کا نام روشن کرے گا۔ تو فکر نہ کر۔ آئندہ تمہاری فیس کو تاخیر نہ ہو گی۔ بس تو پڑھائی کی طرف توجہ رکھ۔ چل اب یہ آنسو پونچھ ڈال اتنے اچھے چہرے پر یہ آنسو بالکل اچھے نہیں لگتے اور وقی کو گدگدی کر کے ہنسا دیا۔ لیکن وقی نے ماں کی توجہ اس کے آنسوؤں کی طرف دلائی۔ بیٹا یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔ دونوں ماں بیٹا ہنستے ہوئے کمرے سے نکلے۔

وقی ہاتھ منہ دھونے باتھ روم چلا گیا اور نورین وقی کے لیے کھانا گرم کرنے کچن میں چلی گئی۔ سالن فرائی پین میں ڈال چولہے پر رکھا اور وقی کے بارے میں سوچنے لگی۔ اسے کیا معلوم ہم کس حال میں ہیں؟ تمہیں اپنے بیٹے کا بھی کبھی خیال نہیں آیا اگر یہی حال رہا تو کیا مجھے وقار کو سکول سے ہٹانا پڑے گا۔ کیا میرا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ کیا میری اُمیدوں کا محل اُدھورا ہی رہے گا۔ کیا میرے ارمان یونہی مچلتے سسکتے دم توڑ دیں گے۔ سالن کو اُبلتا دیکھ کر اس کی آنکھوں سے بھی آنسو اُبلنے لگے۔ نہیں نہیں یکبارگی نورین خیالات سے چونکی۔ میرا خواب ضرور پورا ہو گا۔ میری اُمیدوں کا محل ضرور بنے گا۔ اپنے ارمانوں کو دم نہیں توڑنے دوں گی۔ اپنی آرزُوں اور تمناؤں کے چراغ اپنے خون سے بھی روشن رکھنے پڑے تو پیچھے نہ ہٹوں گی۔ اس سے قبل کہ وقی باورچی خانے میں کھانے کے لیے آتا۔ نورین اپنے طور پر ایک فیصلہ کر چکی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔ اس کے اندر خود اعتمادی کا ایک جذبہ پیدا ہو چکا تھا۔ چند ساعتیں قبل مایوسی اور نا اُمیدی کے بھنور میں گھری ہوئی تھی۔ اب اس فیصلے نے اسے ایک انجانی قوت عطا کر دی تھی۔ اب وہ ہشاش بشاش تھی۔

نورین نے اپنے سُسر کو اس فیصلہ سے آگاہ کیا تو وہ خاموش رہے۔ ان سے کوئی جواب نہ بن پڑ رہا تھا لیکن نورین کے دلائل نے انہیں قائل کر لیا کاش میں اس قابل ہوتا کہ کچھ کر سکتا۔ ورنہ آج میں اپنی نظروں میں یوں نہ گرتا تم میرے گھر کی عزت ہو۔ لوگ کیا کہیں گے۔ تمہارے ماں باپ کیا سوچیں گے۔ جب میرا اپنا ہی بیٹا گھٹنوں نکلا تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ اب دُنیا کچھ بھی کہے۔ نورین کے سُسر نے ہار مانتے ہوئے دُکھ بھرے لہجے میں بات ختم کی۔

بابا تم ایسا کیوں سوچتے ہو۔ بلکہ تمہیں اس بات پر فخر کرنا چاہیے۔ میں حالات سے گھبرا کر ماں باپ کے گھر نہیں گئی۔ ماں باپ کی عزت کے

ساتھ مجھے اس گھر کی عزت جان سے بھی پیاری ہے۔ رہی بات دُنیا کی تو آج تک اس کے ساتھ کون پورا اُترا ہے۔ ٹھیک ہے بیٹی تمہیں خدا اپنے مقصد میں کامیاب کرے۔ بابا نے بالآخر نورین کی بات سے اتفاق کر لیا۔ نورین اپنے طور پر فیصلہ کر چکی تھیں۔ کہیں نہ کہیں ملازمت کروں گی۔ گھر کے خرچے کے ساتھ میرا مقصد بھی پورا ہو گا۔ ایک روز اخبار میں اشتہار تھا چند پڑھی لکھی لڑکیوں کی ضرورت ہے تجربہ و قابلیت ضروری نہیں۔

نورین نے سوچا یہاں کام مل جائے گا۔ مطلوبہ جگہ پہنچی تو اپنی طرح اور بھی بہت سے اُمیدوار دیکھ کر حیران رہ گئی اور سوچنے لگی نہ جانے ان بیچاریوں کی کیا مجبوریاں ہوں گی۔ اسی دوران اس کا نام پکارا گیا۔ ڈرتے ڈرتے اندر داخل ہوئی۔ ایک آدمی ایک بہت بڑی میز کے سامنے براجمان تھا۔ میری درخواست کو دیکھے بغیر میری طرف عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں کی تیز چمک مجھے اپنے جسم کے اندر داخل ہوتے محسوس ہونے لگی۔ یوں لگا جیسے ایکسرے کی شعاعیں میرے جسم کے آر پار ہو رہی ہیں۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں کسی طلسم کدہ میں آ گئی ہوں اور اب میں کسی سحر کی گرفت میں آتی جا رہی ہوں۔ اس سے قبل کہ میں اس کی آنکھوں کی تیز گرمی سے موم کی طرح پگھل جاتی۔ میں بھاگ کر باہر نکل آئی‘ سیدھی گھر آ کر سانس لی۔ آج ریاض کی یاد بھی چلی آئی۔ ریاض کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ یہ حقیقت ہے عورت مرد کے سہارے بنا کچھ بھی نہیں۔ اس سوکھے پتے کی مانند ہے جسے ہوا اپنے سنگ اِدھر اُدھر اُڑائے پھرتی ہے یا پھر کسی کے پاؤں تلے آ کر چُرمُر ہو جاتا ہے۔ یہ چُرمُر کی آواز دراصل اس کی موت کے وقت کی چیخیں ہیں لیکن ہم ان آوازوں سے بے خبر پاؤں تلے مسلتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ وقتی طور پر اس اچانک افتاد سے گھبرائی‘ لیکن پھر اپنے حواس کو مجتمع کیا اور اگلے دن کے لیے اپنے آپ کو تیار کیا۔ خدا کا شکر ہے ابھی مجھ پر میرے غمگسار سُسر کا سایہ تھا جو مجھے قدم قدم پر حوصلہ دیتا‘ میری دلجوئی میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھتا۔ اسی اثناء میں اپنے ہی محلہ میں ایک سکول کا اجراء ہُوا۔ میں نے بھی درخواست دی اور بحیثیت محلہ داری مجھے ترجیحی بنیاد پر منتخب کر لیا آج پھر دھیان ریاض کی طرف چلا گیا کاش یہ سب کچھ ریاض کی طرف سے ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ عورت خواہ کتنا ہی پڑھ لے خود نوکری کرتے ہوئے کتنا بھی کما لے‘ جو خوشی‘ راحت و تسکین مرد کی کمائی ہوئی رقم سے ہوتی ہے جو وہ مہینہ کے آخر میں بیوی کے ہاتھ میں دیتا ہے۔ یہ وہی لوگ محسوس کرتے ہیں جن کو یہ شعور حاصل ہے آج باپ کے ہوتے ہوئے بھی ایک ماں کو ملازمت کرنا پڑی۔ باپ مجبور و لاچار ہوتا تو اور بات ہوتی یہی وجہ تھی کہ جب میں نے پہلی تنخواہ وصول کی تو بہت روئی۔ اس سے زیادہ خوشی تب ہوتی جب یہی رقم ریاض نے بھیجی ہوتی یا لاتا۔ اس کے ساتھ ہی ذہن سے ماضی کا دریچہ کھلا تو ایک ایک پل آنکھوں کے راستے ٹپکنے لگا۔

اس وقت کی بات ہے جب ریاض مہینے کے آخر میں مجھے تنخواہ لا کر دیتا۔ گزارا جیسے تیسے ہو رہا تھا مستقبل کو سامنے دیکھتی تو یہ تنخواہ بہت کم دکھائی دیتی کبھی ریاض سے اس کا اظہار بھی کر دیتی۔ ریاض گو میں اس حال میں بھی خوش ہوں' لیکن کیا ہی اچھا ہو کہ تم اس سے بہتر کوئی کام ڈھونڈو۔ جس میں تمہاری تنخواہ زیادہ ہو۔ دیکھو ناں آج ہم دو ہیں کل تین ہوں گے پھر..... میرا مطلب ہے ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا۔ اگر ہم ابھی سے ایک منصوبے کے تحت چلیں تو مستقبل میں دُشواری پیش نہ آئے گی۔ اچھا سا مکان ہو گا آسائش کی سب چیزیں ہوں گی زندگی کتنی حسین ہو گی ریاض۔ میں ریاض کو قائل کرنے کی کوشش کرتی۔ ریاض مسکرا کر رہ جاتا۔ بات آئی گئی ہو جاتی۔ ایک دن ریاض نے آ کر مجھے خوشخبری سناتے ہوئے کہا۔ نورین خوش ہو جاؤ۔ خدا نے تمہاری دُعا سُن لی' تمہاری آرزُوئیں پوری ہونے کے دن آ گئے ہیں وہ کیسے؟ میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔ ریاض نے جب پوری بات سُنائی تو میں بھی بہت زیادہ خوش ہوئی شاید ریاض سے بھی زیادہ۔ ریاض نے بتایا۔ آج اچانک بازار میں میرے ایک ہم جماعت سے ملاقات ہو گئی۔ میٹرک تک ہم اکٹھے پڑھے۔ میں کالج میں چلا گیا تو وہ باپ کے ساتھ مل کر زندگی کی گاڑی کھینچنے لگا پہلے کبھی کبھار ملاقات ہو جاتی تھی پھر سلسلہ اچانک منقطع ہو گیا۔ میں نے بھی خاص نوٹس نہ لیا۔ اتنے عرصہ بعد پھر ملاقات ہوئی زندگی کے اس موڑ پر اچانک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے دفتر کی کرسیاں توڑ رہا ہوں اور وہ ایک ٹھاٹھ باٹھ میں ہے۔ باتوں باتوں میں اس نے میرے کام کے بارے پوچھا میں نے بے دلی سے سب کیفیت بیان کی جو مجھ پر طاری تھی' اس نے خود ہی کہا ہے میں واپس جا کر تمہارے ویزے کا بندوبست کرتا ہوں۔ نورین مجھے اس پر مکمل بھروسہ ہے وہ یقیناً میرے لئے کچھ کرے گا۔ ریاض تو تفصیل بتا کر خاموش ہو گیا اور میں اُسی وقت سے آنے والے وقت کا بے تابی سے انتظار کرنے لگی۔ خواب ہی خواب میں کئی بار اپنے آپ کو عالیشان گھر میں پاتی۔ گھر میں نوکرانیاں کام کر رہی ہیں' اور میں انہیں ہدایت دیتے اِدھر اُدھر جاتی۔ جب خیالات سے چونکتی تو من ہی من میں مسکرا اُٹھتی۔ اسی دوران وقار کی پیدائش ہوئی۔ ریاض بہت خوش تھا اللہ تعالیٰ نے اسے بیٹے کی نعمت سے مالا مال کیا تھا۔ اب دولت سے مالا مال ہونے کا انتظار تھا۔ ریاض کے دوست نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا۔

ویزا آیا تو میں نے خوشی خوشی ریاض کی تمام تیاری مکمل کی۔ نجانے اس وقت مجھے ذرّہ بھر بھی ریاض کے بچھڑنے کا غم نہ ہُوا۔ شاید میں اچھے دنوں کی خوشی کے پیچھے چھپی غم کی تصویر نہ دیکھ سکی۔ پہلے پہل تو باقاعدگی سے محبت بھرے خط اور اچھی خاصی رقم کا ڈرافٹ آتا۔ میں مارے خوشی کے نڈھال ہو جاتی۔ کبھی کبھی اپنے سُسر کو بھی فخریہ انداز سے کہتی۔ بابا میں نے ہی ریاض کو اس طرف راغب کیا ہے ورنہ ریاض تو ساری عمر یونہی اور یہاں ہی گذار دینا چاہتا تھا۔ بابا کبھی کبھی میری اس بات پر مسکراتا تو نجانے یہ

مسکراہٹ اچھی کیوں نہ لگتی مجھے یوں محسوس ہوتا بابا میری بات کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود میں پرواہ نہ کرتی۔ کچھ ہی عرصہ بعد خطوں کے درمیان فاصلہ بڑھنے لگا۔ میں تشویش ظاہر کرتی تو جواب میں کام کی زیادتی بتاتے کہ آج کل اوور ٹائم چل رہا ہے میں اور خوش ہوتی۔ میری سوچوں کی اُڑان بھی تیز ہونے لگی۔ کوئی بات نہیں جتنا زیادہ کام کریں گے اتنے زیادہ اور جلدی پیسے اکٹھے ہوں گے۔ یوں ہم جلدی ہی خوشحال ہو جائیں گے۔ لیکن کیا خبر تھی کہ اتنی اونچی اُڑان سے گر کر چکنا چور بھی ہو جاؤں گی۔ آخر وہی ہوا جو اونچی اُڑان والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ غم کی تیز ہوا کے سامنے میرے پَر بے بس ہو گئے اور میں دھڑام سے نیچے آ گری۔ آرزوؤں کا محل چکنا چور ہو گیا اُمیدیں اور تمنائیں مٹی میں مل گئیں۔

اسی دوست کی زبانی پتہ چلا چونکہ وہاں ماحول آزاد ہے۔ عورت اور مرد اکٹھے کام کرتے ہیں۔ اسی دوران ایک ساتھ عورت سے شناسائی ہو گئی۔ میں نے سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن ریاض اس قدر آگے بڑھ چکا ہے کہ واپس آنا مشکل ہے۔ اب تو اس نے باقاعدہ اس عورت کے ساتھ شادی کر لی ہے۔ میں زیادہ زور بھی نہ دے سکا مبادہ دوست کے دل میں یہ خیال نہ آئے کہ ویزہ بھیج کر مجھے تنگ کر رہا ہے۔ یا شاید میں اس کے لیے بُرا سوچ رہا ہوں۔ میں اتنا سُن کر بھی خاموش رہی۔ اس لئے کہ ان سب حالات کی ذمہ داری میں ہوں۔ میں نے ہی اچھے دنوں کی اُمید پر اپنے ریاض کو قربان کر دیا۔ جب آمدن کم تھی تو ریاض میرا تھا۔ دھن زیادہ آنے لگا تو ریاض دُور ہوتا چلا گیا۔ اب نہ تو دھن رہا نہ ریاض ہی۔ نجانے مرد اتنا خودغرض کیوں ہے؟ بُرے دنوں میں تو بیوی کے ساتھ ہی رہتے ہیں، اچھے دنوں کے آتے ہی پُرانا ساتھی کسی..... پُرانی چیز کی مانند ناکارہ ہو جاتا ہے۔ کیا اچھے دنوں میں پُرانے ساتھی کا کوئی حصہ نہیں۔ انہیں ان مشکلات کا صِلہ کوئی نہیں دیتا جب وہ مشکلات میں برابر کا شریک ہوتے ہیں۔ مرد تو اپنی عیاشی اور طبع تفریح کے لیے ہزاروں راستے نکال لیتے ہیں۔ اور عورت بیچاری تقدیر کی ماری سسکتی رہتی ہے۔ گیلی لکڑی کی طرح آہستہ آہستہ جلتی ہے۔ انجام خاک ہو کر غم کی تیز آندھیوں میں تحلیل ہو کر رہ جاتی ہے۔ کبھی عورت اور مرد کو ایک گاڑی کے دو پہیے کہا جاتا تھا۔ آج کے جدید دور میں گاڑی ایک پہیئے سے بھی چل رہی ہے گاڑی کے خراب پہیئے کی طرح پہیہ تبدیل بھی کر لیا جاتا ہے۔ جیسے میں ایک ہی پہیہ سے زندگی کی گاڑی کھینچنے کی کوشش کر رہی ہوں اس سے پہلے کہ ریاض میں گاڑی کھینچنے سے معذور ہو جاؤں۔ میں چاہتی ہوں میرا ساتھ دو۔ جس منزل کے لئے ہم نے مل کر سفر شروع کیا تھا اسے مل کر ہی طے کریں ریاض منزل ہمیں پکار رہی ہے۔ راستے میں ملنے والے راہی منزل تک ساتھ نہیں دیا کرتے۔ تم اپنی منزل کے مسافر ہو دو کسی اور منزل کے۔ تم شاید راستہ بھول گئے ہو۔ پھر بھی چلے آؤ۔ راستہ تمہیں میں بتاؤں گی۔ منزل ہماری منتظر ہے۔ اپنا راستہ ایک، ایک ہی منزل وہ ہے وفا۔

وہ آج بھی اُس کی واپسی سے نااُمید نہیں ہوئی۔

☆☆☆☆☆

وہ بھی کیا دن تھے [ہوزے ساراماگو کا ایک افسانہ]

Portugal-born Nobel Prize winner who ignored punctuation - The ...José Saramago is the only Portuguese citizen to win the Nobel Prize in Literature, receiving the honor in 1998 for his imaginative, compassionate, and ironic parables. Known for works like Blindness, the communist/atheist author lived in Lanzarote due to past censorship by the Portuguese government. José Saramago (1998 Nobel Prize in Literature)Significance: The first and only Portuguese-language writer to win the literature prize.Recognition: Praised for his ability to make "elusory reality" tangible through parables.Key Works: Blindness (1995), The Gospel According to Jesus Christ (1991), The Stone Raft (1986), and All the Names (1997) Wikipedia.Legacy: Known for his unique style with long sentences and minimal punctuation, focusing on social critique, human dignity, and historical reinterpretation.

ترجمہ: ظہور احمد

اور میری زندگی میں دو سنہری دن بھی گزرے جب میں پورے ریوڑ کا رکھوالا تھا اور ان دنوں کے درمیان آنے والی رات بھی اتنی ہی سنہری تھی۔ ذرا ان کے بارے میں سوچیے جو گاؤں میں پیدا ہوئے مگر جلد ہی وہاں سے بچھڑ گئے اور پھر ہمیشہ ایک دور سے آنے والی آواز گونجتی رہی جس میں ایک خاموش التجا، ایک بے نام آس، ایک صدائے سوز اور روشنی اور خوشبوؤں کا مجزاتی تاثر شامل تھا۔ گم گشتہ بہشت کی داستان دراصل بچپن ہی کی کہانی ہے اور کچھ نہیں یا پھر وہ حقیقتیں ہیں جن کو ہم ہمیشہ سر کرنے کی

خواہش کرتے رہے اور وہ خواب جو ہم نے دیکھے ان کی تعبیر ایک غیر محسوس کن مستقبل میں چھپی رہی اور ایسا نہ ہو تو ہم بھی نہیں جانتے کہ ہم کیا کریں۔ میں تو کم از کم نہیں۔

چونکہ سارے سور کے بچے بکے نہیں تھے میرے دادا دادی نے فیصلہ کیا کہ بقیہ ریوڑ کے بچوں کو سانتا رام کی منڈی میں بھیج دیا جائے تا کہ ان پر مزید رقم بھی خرچ نہ کرنی پڑے اور قیمت بھی مناسب مل جائے۔ مگر وہاں پہنچنے کے لیے چار کوس کا پیدل سفر طے کرنا تھا جس کی رفتار سور کے چھوٹے بچوں کی رفتار سے زیادہ نہیں ہو سکتی تھی تا کہ جانور منڈی میں تازہ دم پہنچ سکیں۔ مجھ سے پوچھا گیا کیا میں اپنے سب سے چھوٹے چچا کی مدد کو جانا چاہتا ہوں میں نے فوراً حامی بھری اور سوچا کہ اگر مجھے ریگ کر بھی جانا پڑا تو میں ضرور جاؤں گا۔ میں نے سفر کے لیے اپنے جوتے پالش کیے اور سٹور سے اپنے نحیف بارہ سالہ جسم کے لیے مناسب سی چھڑی کا انتخاب کیا۔ میں ہمیشہ اپنے دل کی بات دل ہی میں رکھتا تھا، تو تب بھی میں نے خوشی کے نعروں کو اپنے دل میں دبائے رکھا۔ اور وہ دن ہے اور آج کا دن، میں اپنے جذبات کا کبھی کھل کر اظہار نہیں کر سکا۔

ہم نے دوپہر ڈھلتے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ میرے چچا ریوڑ کے آخر میں تھے تا کہ کوئی سور کا بچہ گم نہ ہو جائے اور میں آگے آگے چل رہا تھا مجھے ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے میں کشتی کے سامنے والے بادبان جیسا ہوں جو آگے آگے چلتا ہے اور اپنے خواب و خیال کے قذاقوں کی کشتیوں کی طرح میں تمام رستوں اور شاہراؤں میں گھومتا چلا جا رہا تھا۔ بعض اوقات میرے چچا مجھ سے جگہ تبدیل کر لیتے اور مجھے چھوٹے جانوروں کی چھوٹی چھوٹی ٹانگوں سے اُڑنے والی گرد سے میرا چہرہ اٹ جاتا اس دوران سورنی ماں جو کچھ کی نگی ماں تھی اور کچھ کی ادھاری، ان سب کو اکٹھا رکھے ہوئے تھی۔

رات ڈھل چکی تھی جب ہم اس فارم میں پہنچے جہاں ہم نے رات گزارنی تھی۔ ہم نے مویشیوں کو چھپر میں بند کیا اور اپنے ساتھ لائے ہوئے سادہ کھانے کو کھایا۔ ہم ایک روشن کھڑکی کے سامنے کھڑے تھے کیونکہ ہم اندر جانا نہیں چاہتے تھے یا شاید ہمیں اس کی اجازت نہیں تھی۔ ہمارے کھانے کے دوران ایک نوکر نے آ کر ہمیں بتایا کہ ہم باہر اصطبل میں سو سکتے ہیں۔ اس نے ہمیں دو اونی کمبل دیئے اور چلا گیا۔ کتے کھلے چھوڑے ہوئے تھے اور ہمارے پاس یہاں سونے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اصطبل کا دروازہ رات بھر کھلا رکھنا تھا جو ہمارے لیے بہتر تھا کیونکہ ہمیں علی الصبح نکلنا جو تھا تا کہ ہم منڈی کے شروع ہونے سے پہلے سانتا رام پہنچ جائیں۔

ہمارے بستر پچھلی دیوار کے ساتھ جانوروں کی کھرلی کے ساتھ تھے۔ گھوڑے گہری سانسیں لے رہے تھے اور بھوسے سے اَٹے ہوئے بجری والے فرش پر زور زور سے پاؤں مار رہے تھے۔ میں ایسے سویا جیسے میں ایک جھولے میں کمبل میں لپٹا ہوا سو رہا ہوں۔ میرے پاؤں دُکھ رہے تھے

اور میں بہت تھکا ہوا تھا۔ رات کی تاریکی گرم اور گہری تھی اور گھوڑے ساری رات اپنا سر ہلاتے تھے اور میرے چچا گہری نیند سو رہے تھے۔ رات کا شور چھت کے اوپر سے گزر گیا۔ اور اگر میری دادی وہاں ہوتی تو وہ کہتی کہ میں ایک فرشتے کی طرح سویا۔

اگلے دن علی الصبح جب مجھے میرے چچا نے مجھے آواز دی تو میں جاگ گیا۔ میں اپنے بستر میں اُٹھ بیٹھا اور میں نے اچانک دروازے کی طرف دیکھا تو میری خوابیدہ آنکھیں ایک انجان روشنی سے چکا چوند ہو گئیں۔ میں اُٹھا اور صحن کی طرف چل دیا۔ میرے سامنے ایک پورا چمکتا چاند تھا جو اتنا سفید تھا کہ جیسے کسی نے رات کے اس منظر پر دودھ انڈھیل دیا ہو اور اگرچہ، جیسا کہ میں نے کہا کہ میں اس وقت صرف بارہ سال کا تھا مگر میں نے جان لیا کہ اب میں ایسا چاند عمر بھر نہیں دیکھ سکوں گا اسی لیے میں اب چاندنی سے بہت زیادہ متاثر نہیں ہوتا کیونکہ میرے اندر جو روشنی ہے اس کا کوئی مقابلہ نہیں۔

ہم نے ریوڑ کو ساتھ لیا اور آہستہ آہستہ وادی میں اترنے لگے کیونکہ راستے میں خاردار جھاڑیاں اور پتھر تھے اور جانور اتنی جلدی سفر کے عادی نہیں تھے اور قدم قدم پہ بھٹک رہے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ سب کچھ آسان ہو گیا ہم پرانی انگور کی بیل کے ساتھ ساتھ رستے پر چلتے رہے جہاں رات کی ٹھنڈی ہوا نے رستے کی گرد کو تسخیر کیا ہوا تھا۔ اور پھر میں نے انگور کی بیلوں پر چھلانگ لگائی اور دو بڑے انگور کے گچھے اپنے کوٹ میں ڈال لیے۔ ساتھ ساتھ میں ادھر ادھر دیکھتا بھی جا رہا تھا کہ کہیں باغ کا دربان نہ آ جائے پھر میں دوبارہ اپنے رستے پر چل پڑا اور ایک انگور کا گچھا اپنے چچا کو دے دیا۔ چلتے چلتے ہم ٹھنڈے میٹھے انگور کھاتے رہے جو اتنے سخت تھے کہ جیسے پتھر کے ہوں۔

جب ہم سانتا رام کی چڑھائی چڑھنے لگے تو سورج طلوع ہو رہا تھا۔ ہم نے وہ پوری صبح اور دوپہر کا کچھ حصہ مویشی منڈی میں گزارا پھر بھی ہم تمام جانوروں کو بیچ نہیں سکے اور اس لیے ہمیں واپسی پر بھی پیدل ہی آنا پڑا اور ایسے میں وہ واقعہ پیش آیا جو آئندہ شاید کبھی نہ ہو۔ بادلوں کا ایک دائرہ ہمارے سروں پر چھا گیا اور غروب آفتاب سے کچھ پہلے وہ بادل گہرے ہو کر برسنے لگے اور پھر ہم بہت دیر تک ایسے چلتے رہے کہ ہمارے اوپر بارش کا ایک قطرہ بھی نہ گرا جبکہ ہمارے آگے پیچھے ایک دائرے کی شکل میں پانی کے پردے نے اردگرد کو ڈھک لیا تھا پھر اچانک بادل غائب ہو گئے اور رات زیتون کے درختوں میں سے آہستہ آہستہ نازل ہوئی۔ جانور ایسے شور مچا رہے تھے کہ جیسے ان کی گفتگو ختم ہونے کو آ ہی نہیں رہی۔ میرے چچا چلے جا رہے تھے اور مزے سے سیٹی بجاتے جا رہے تھے۔

اس سارے منظر کو دیکھ کر میرے دل پر رقت طاری ہوئی کوئی مجھے نہیں دیکھ سکا مگر میں سب کو دیکھ سکتا تھا یہ وہ وقت تھا جب میں نے عہد کیا کہ میں کبھی نہیں مروں گا۔

☆☆☆☆☆

غزلیں

مجہول گمانوں کا گرفتار نہ تھا دل
محزوں تھا مگر شہر سے بیزار نہ تھا دل

آوارہ و بے سمت بھٹکتی رہیں سوچیں
احساس پہ جس عہد نگہدار نہ تھا دل

ہر درد کی ٹیسوں کو حدِ ضبط میں رکھا
تالیف و تسلّی کا طلبگار نہ تھا دل

سپنوں کے سبھی شیش محل ڈھیر پڑے تھے
لیکن کسی گوشے میں بھی مسمار نہ تھا دل

ممنون ہوا دعوتِ انکار طلب پر
تب گھر سے نکلنے کو بھی تیار نہ تھا دل

درویش رہا کوچۂ پندار کا تا عمر
دریوزہ گر نخوتِ دربار نہ تھا دل

جس طور اب اپنوں نے حصارا اِسے عالی
ایسا تو کبھی بے بس و لاچار نہ تھا دل

جلیل عالی

مسخ و مجہول کہانی ہی اگر رخت میں ہو
کیا کوئی منزلِ شادابیِ جاں بخت میں ہو

قطرہ قطرہ خوشی پانے میں بھی لذت ہے مگر
وہ مسرت جو کسی مژدۂ یک لخت میں ہو

دیر اور دور تلک رکھنی ہے امید اُس سے
شاید اک گوشۂ نرم اس کے دلِ سخت میں ہو

اس کے اندر کوئی فن کار چھپا ہوتا ہے
دل کسی شخص کا بے وجہ اگر وخت میں ہو

دیکھ کثرت میں ہے وحدت کا غزل آئینہ
زندگی جیسی اکائی جو کئی لخت میں ہو

فیصلہ کوئی ، ارادہ کوئی ، کوشش کوئی
یہ بھی تو جزوِ دعا ہے کہ کہیں بخت میں ہو

راج وہ ہے جو دلوں پر کیا جائے عالی
کیا وہ شاہی کہ سکت جس کی فقط تخت میں ہو

غزل

ہر پَل دہک رہی ہے جو مُجھ میں سخن کی آگ
بھڑکی ہوئی ہے دل میں کسی کی لگن کی آگ

روشن جو رات دِن مُجھے رکھتی ہے اِس قدر
خوشبو کے لمس کی ہے یہ، گل کے بدن کی آگ

پہلے تو اُس کی آگ نے مُجھ کو جلا دیا
پھر اُس بدن میں بھر گئی میرے بدن کی آگ

یوں اُس کے رُخ پہ بیر بہوٹی کے رنگ ہیں
گویا سمٹ کے آئی ہو گُل میں چمن کی آگ

دِل جل رہا ہے کوئی بدن کی خبر بھی لو
اِس شہر کو بھی راکھ نہ کر دے یہ بَن کی آگ

یکدم جو مُجھ میں ایک الاؤ دہک اُٹھا
میری نہیں، یہ ہے مِرے شعلہ بدن کی آگ

کس کام کی ہیں سب سخن آرائیاں نسیمؔ!
گر منعکس نہ اِن میں سے ہو فکر و فن کی آگ

نسیم سحر

غزلیں

ویسے تو آنکھ بھر کے کہاں دیکھتا ہُوں مَیں
دیکھوں تو پھر کراں تا کراں دیکھتا ہُوں مَیں

چپ ہو رہو تو مَیں بھی نہ دیکھوں تمھیں کبھی
پوچھو تو یہ کہوں گا کہ ہاں دیکھتا ہُوں مَیں

مجھ کو ملی ہے معدنِ قدرت سے وہ نظر
کِھلتے ہیں سرخ پھول جہاں دیکھتا ہُوں مَیں

دریائے چشم خشک نظر آتا ہے مجھے
صحرائے دل میں آبِ رواں دیکھتا ہُوں مَیں

بھاتا نہیں ہے اور کسی کا سخن کہ جب
میر و اسد کا طرزِ بیاں دیکھتا ہُوں مَیں

خاور اعجاز

کیا ہے موجود تہہِ آب مرے بارے میں
پوچھتا پھرتا ہے گرداب مرے بارے میں

کھُل گئی میری محبت کی کہانی اُس پر
اُس کو بھی آنے لگے خواب مرے بارے میں

اَب تو معدوم ہے تحریف کے باعث ورنہ
ہر صحیفے میں تھا اِک باب مرے بارے میں

فرطِ جذبات میں شعلوں کو نہ چھو لوں مَیں کہیں
ہے پریشاں دلِ بے تاب مرے بارے میں

جانتے ہیں کہ مَیں ہُوں مہرِ منور خاورؔ
کیا کہیں انجم و مہتاب مرے بارے میں

غزل

جب سے لہو کو رنگ حنا ماننے لگے
صر صر کو لوگ باد صبا ماننے لگے

لازم ہوا ہے جب سے یہاں احترام شب
ظلمت کو لوگ رب کی عطا ماننے لگے

ظاہر کا خوف پھیل کے باطن پہ چھا گیا
ہم اپنی زندگی کو سزا ماننے لگے

دن میں بھی چل رہا ہے یہاں کاروبار شب
کھوٹے کو لوگ جب سے کھرا ماننے لگے

آنکھیں کھلی ہوں ذہن رسا بھی ہو جس کے پاس
کیسے وہ ہر کسی کا کہا ماننے لگے

اک پل میں اتنے رنگ بدلتی ہے زندگی
اب کیا کوئی ہرے کو ہرا ماننے لگے

شب کے خلاف اس کے سوا کچھ نہیں کیا
ہم اپنی حسرتوں کو دعا ماننے لگے

عادت سی بن گئی تھی محبت سے دیکھنا
پھر یوں ہوا کہ لوگ برا ماننے لگے

ہر حکم پر کیا سر تسلیم خم کنور
ایسا نہیں کہ دل کو خدا ماننے لگے

اعجاز کنور راجہ

غزل

لمحہ کوئی روز و شب کا ہو، اسی کا دھیان ہے
جو رگ و ریشہ میں اترا ہے، وہ میری جان ہے

جاں فشانی تیری کیسے بے ثمر ہو جائے گی
جب ستارہ آخر شب کا، سحر امکان ہے

چاہتوں کا کاروبار دل نشیں ٹھپ ہو گیا
بام و در اجڑے ہوئے ہیں، سارا گھر ویران ہے

زیب و زینت کی کشاکش کن حدوں میں آ گئی
پیرہن ننگ بدن ہے، چاک ہر دامان ہے

نت نئے فتنوں کا چمکا کاروبار کذب بھی
یہ ستم ہے، عیب جوئی جس کی پشتی بان ہے

دل کے آنگن میں بسا لینا ستارے کی جھلک
اے شب تیرہ نشاں، یہ آخری ارمان ہے

آخر شب کو سہی، بیٹے کی دستک آئے گی
آس قائم ہے یہ ماں کی، اس کو اطمینان ہے

ہو سلیقہ تو ہنر کار آفریں ہو جائے گا
بے طرح کے کام میں تو ہر طرح نقصان ہے

جب وہ کشکول گدائی ہاتھ میں سجتا گیا
زور و زر کا ہر کرشمہ بے سر و سامان ہے

سادگی نے پر تکلف سلسلوں کی راہ لی
چشم فطرت اس عجوبے پر بڑی حیران ہے

ہو ریاضِ دل میں ہر لمحہ شگفتہ، تا ابد
اسم اعظم کا گل تازہ، یہی ایمان ہے

سید ریاض حسین زیدی

غزل

راہِ مفر دشوار ہے جی
ہر جانب دیوار ہے جی

آپ کی باتوں میں سنگینیں
لہجے میں تلوار ہے جی

اس کی آنکھ اگر پڑ جائے
سمجھو بیڑا پار ہے جی

مجھ سے زیادہ ہے دکھ اس کا
میرا جو غمخوار ہے جی

آگے ہے موجوں کی مرضی
کشتی بے پتوار ہے جی

جس بھی گہرائی میں جائیں
غار کے اندر غار ہے جی

راحت دنیا کے چہرے پر
صدیوں کی پھٹکار ہے جی

راحت سرحدی

غزل

صفدر صدیق رضی

ہدف کو تیر و سناں سے نکال دیتے ہیں
ستم کی رسم جہاں سے نکال دیتے ہیں

وہ آنکھ زخم کو اب مندمل نہیں کرتی
اسے بھی چارہ گراں سے نکلا دیتے ہیں

جو وعدے تم سے وفا ہو نہیں سکے ان کو
تمھارے لفظ و بیاں سے نکال یدتے ہیں

اڑان بھر کے پرندے پلٹ کے آتے نہیں
انھیں پیامبراں سے نکال دیتے ہیں

جو لوگ ڈوب کے دریا کو پار کر نہ سکیں
انھیں ہم آبِ رواں سے نکال دیتے ہیں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اپنا نہ سکا ، تیرے بتائے ہوئے رستے
لیکن ترے مانند کسی کا نہ ہوا میں

غزل

شوقِ دیدار ہو نگاہوں میں
حسن بکھرا پڑا ہے راہوں میں

جب وہ اس راستے سے گزرے گا
کھل اٹھیں گے کنول نگاہوں میں

اتنے جاہ و جلال کے ہوتے
خوف ہے کیوں جہاں پناہوں میں

خود فریبوں کی منزلیں پالیں
کھو گئے خود شناس راہوں میں

جب جہاں میں کہیں سکوں نہ ملا
آ کے بیٹھے ہیں خانقاہوں میں

خامشی میرا جرم ہے ساجد
بولنا بھی مرا گناہوں میں

شریف ساجد

غزل

ہم پہ الزام دھر گئی تتلی
خود پیا کے نگر گئی تتلی

پھول کو ٹھنڈ سے بچاتے ہوئے
آپ سردی سے مر گئی تتلی

ایک دن خواب میں میرے آئی
آنکھ رنگوں سے بھر گئی تتلی

سب جوانی کے رنگ پھیکے پڑے
اپنی صورت سے ڈر گئی تتلی

پھنس گئی مکڑیوں کے جالے میں
اور جاں سے گزر گئی تتلی

بیٹھ کر آپ کی ہتھیلی پر
اور بھی کچھ سنور گئی تتلی

دستکیں دے کے بند کھڑکی پر
پھول شیشے پہ دھر گئی تتلی

دفن کس نے کیا کتابوں میں؟
کس کے ہاتھوں بکھر گئی تتلی؟

رنگ چمکے نہا کے بارش میں
دیکھو کتنی نکھر گئی تتلی

سیکھے اس نے فریب دنیا کے
وعدہ کرکے مکر گئی تتلی

نیل سارے بدن پہ آئے نظر
کسی ظالم کے گھر گئی تتلی

جب بھی سورج کو چومنے آئی
راکھ ہوکر بکھر گئی تتلی

ایک شب کو عقیل چپکے سے
میرے دل میں اتر گئی تتلی

عقیل رحمانی

غزل

لے کے آیا ہے ازل سے قصہ خوانی آدمی
خود بھی آخرکار بنتا ہے کہانی آدمی

سوچتا رہتا ہوں اکثر میں اِسی اک بات پر
جب ہے خالق اُس کا باقی، کیوں ہے فانی آدمی

کاروبارِ عشق ہو یا بندوبستِ رزق ہو
مشکلیں کرتا ہے پیدا درمیانی آدمی

پاؤں اس کے ہیں زمیں پر اور آنکھیں چرخ پر
اس زمیں کا ہو کے بھی ہے آسمانی آدمی

بھول سکتا ہی نہیں گزرے ہوئے حالات کو
یاد رکھتا ہے نشانہ یا نشانی آدمی

کاروبارِ زندگی چلتا نہیں اس کے بغیر
ڈھونڈتا رہتا ہے اکثر دانا پانی آدمی

جستجو گلزار اس کی مستقل جاری رکھو
سامنے آ جائے شاید داستانی آدمی

گلزار بخاری

غزلیں

جانے کیا ڈھائے غضب موسم اداس
آنے والا ہے جو اب موسم اداس

ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا جواز
لگ رہا ہے بے سبب موسم اداس

ان اثاثوں کو سنبھالیں کس طرح
دے گیا ہے غم عجب موسم اداس

احمد جلیل

دل میں وہ درد خزانہ تھا امیروں کی طرح
اشک پلکوں پہ دمکتے رہے ہیروں کی طرح

یہ الگ بات کہ کشکول رہا خالی ہی
ورنہ ہر در پہ صدا دی ہے فقیروں کی طرح

اس نے پرکاٹ کے پنچھی کو رہائی دی ہے
ہو کے آزاد بھی اب ہے وہ اسیروں کی طرح

جسم بھی مشقِ ستم کے لئے اب مانگتا ہے
بات میں جس کے عجب کاٹ ہے تیروں کی طرح

اتنے بھی ہم نابلد اس سے نہیں
کہتا ہے جو زیرِ لب موسم اداس

جب سے روٹھا ہے کوئی ہم سے جلیل
قریہء جاں کے ہیں سب موسم اداس

ہاتھ ریکھاؤں کی تحریر ہی کچھ ایسی تھی
عمر بھر الجھے رہے جس میں لکیروں کی طرح

مجھ کو نفرت سے بھی نفرت ہے سو دنیا میں جلیل
پھرتا رہتا ہوں محبت کے سفیروں کی طرح

غزل

یہ دشت ہم کو خاک اڑا کر دیا گیا
جلتا ہوا چراغ بجھا کر دیا گیا

تیرے شجر کا بُور سلامت رہے مگر
گلشن ہمیں تو آگ لگا کر دیا گیا

وہ خواب میری آنکھ کی پتلی نے رد کیا
جو خواب دوسروں کو دکھا کر دیا گیا

وہ لوگ دو جہاں کے غموں میں الجھ گئے
جن کو تمہارے غم سے رہا کر دیا گیا

حسنِ بیاں میں حسنِ تکلم کی چاشنی
پانی ہمیں شراب ملا کر دیا گیا

جھیلی بہت سی دھوپ تو چھاؤں ملی ہمیں
اور قہقہہ بھی خوب رلا کر دیا گیا

ابھرا کرے گا چاند ہماری جبین سے
بوسہ اگر گلے سے لگا کر دیا گیا

افتخار شاہد

غزل

دکھ عشق میں اس دل کو نہایت ہی ہوا ہے
لیکن جو ہوا حسب روایت ہی ہوا ہے

ہر اشک ہے اک آئینہ علم و بصیرت
یہ درد کا تحفہ بھی عنایت ہی ہوا ہے

چند ثانیوں میں ہیرے جواہر نہیں بنتے
پتھر میں حسیں رنگ سرایت ہی ہوا ہے

احوال دلِ زار سے تو پاتا ہے تسکین
بار اس پہ فقط حرف شکایت ہی ہوا ہے

جاں لینے کی جاں دینے کی تھی بات ہی مشکل
اس بزم میں یہ کام رعایت ہی ہوا ہے

دیوار بنائی گئی دیوار بھی اونچی
ہمسایہ بھی اب اپنا ولایت ہی ہوا ہے

وہ چشمہ کہ جو پھوٹا رضا دہنِ نبی سے
ہر قطرہ ہمارے لیے آیت ہی ہوا ہے

رضا اللہ حیدر

غزل

امن کی اب فضا بحال کہاں
شور ہر سُو ہے قیل و قال کہاں

غم کے ہر سُو مہیب سائے ہیں
زندہ رہنے کا احتمال کہاں

جو کبھی تھا سکون کا باعث
مال ہے وہ کہاں ، منال کہاں

یہ تو جنت نصیر تھی کل کی
میری دنیا کا اب جمال کہاں

میری پہچان میرا ورثہ تھی
اب وہ تلوار اور ڈھال کہاں

جسکا شہرہ رہا زمانے میں
میرے آباء کا وہ کمال کہاں

اپنے مالک کے ہم جو باغی ہیں
اور آئے گا پھر زوال کہاں

تیری یادوں سے ہو کبھی غافل
تیرے اقبال کی مجال کہاں

مجھکو گھیرا سروبہ گردش نے
اب طبیعت رہی بحال کہاں

اقبال سروبہ

غزل

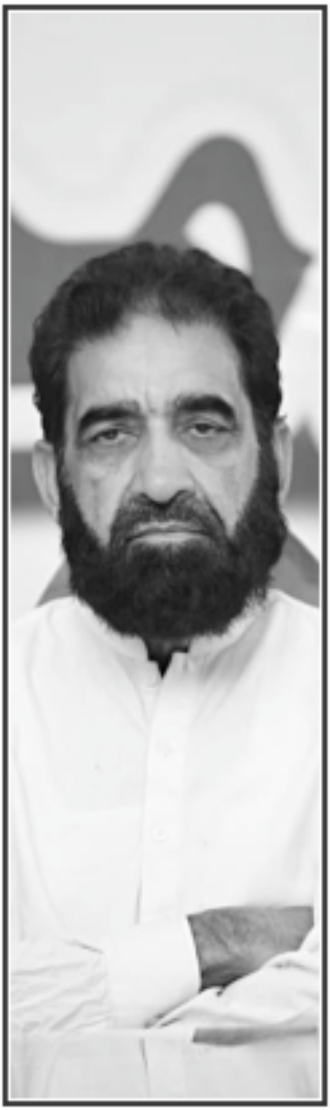

سعد اللہ شاہ

سر پہ ہیں آپ پاؤں میں زنجیر آپ کی
یعنی کہ ہم سراپا ہیں تسخیر آپ کی

ایسی جگہ لگی تھی کہ بس کچھ نہ پوچھیے
ہم دیکھتے ہی رہ گئے تصویر آپ کی

کیوں دوسروں کو ہاتھ دکھاتے رہے ہیں آپ
تھی آپ ہی کے ہاتھ میں تقدیر آپ کی

ہم کو تو اک اشارہ ہی کافی تھا اور یہاں
دیوار پر نوشتہ ہے تحریر آپ کی

کچھ نیک نایم آپ کمائیں تو بات ہے
ویسے تو کافی ہو چکی تشہیر آپ کی

اچھا ہے انتظار کرانا بھی کچھ نہ کچھ
اب جان ہی نہ لے لے یہ تاخیر آپ کی

تم جاگتے ہو رات کے پچھلے پہر میں سعد
تنہائی کا یہ وقت ہے جاگیر آپ کی

بے ساختہ وہ سعد جی سر تو ہلائیں گے
سن لیں غزل جو میر تقی میر آپ کی

غزل

اندھیری رات کو یوں راستا دیا گیا ہے
میں اک دیا تھا، مجھے بھی بجھا دیا گیا ہے

اب اس پہ اور کوئی فیصلہ ہی آئے گا
اک ایسا فیصلہ جس کو سنا دیا گیا ہے

بٹھا کے اک سگِ آوارہ گھر کے زینے پر
ہمیں ہمارے گھروں میں سلا دیا گیا ہے

کشادگی کی طلب تھی زمین زادوں کو
جو پاس بیٹھے تھے ان کو اٹھا دیا گیا ہے

بھرے ہوئے تھے رعونت سے، یوں گرے آخر
زمیں پہ جیسے فلک کو گرا دیا گیا ہے

زباں کو قید کیا ہے سفید قلعے میں
کھلے تھے ہونٹ جو ان کو ملا دیا گیا ہے

اب اس سے زیادہ نہ اٹھتا تھا بارِ خوابوں کا
جو شب کے سوئے تھے، ان کو جگا دیا گیا ہے

ہنسی نے لاد دیئے اشک سرد پلکوں پر
جو رونے والے تھے ان کو رلا دیا گیا ہے

مقابلے میں زمیں کے گھماؤ کے غافر
بس ایک ایڑی پہ خود کو گھما دیا گیا ہے

غافر شہزاد

غزلیں

وہ جنوں ہے یہاں، ایمان بہت ڈرتا ہے
ایُھاالنّاس! اب انسان بہت ڈرتا ہے

اتنا سلگایا گیا ہے اسے کم عرصہ میں
قبرِ تازہ سے یہ لوبان بہت ڈرتا ہے

آتشیں رنگ میں پوشاک رنگی ہے میری
شبنمی لَو سے بھی دامان بہت ڈرتا ہے

چار جانب مرے، سرگوشیاں کرتے سائے
بے اماں خانۂ ویران بہت ڈرتا ہے

فصل اُگتی ہے دمکتے ہوئے خوں کی طاہر
جنگ ہے، جنگ کا میدان بہت ڈرتا ہے

قیوم طاہر

کیا بتاؤں اے فزوں ہوتے ہوئے کارِ جنوں
میری پیشانی میں چبھتا ہے بہت خارِ جنوں

سب کے ہاتھوں میں یہی خاک ذرا سی آئی
تجھ سے پہلے بھی، بہت تجھ سے گرفتارِ جنوں

دشت کے بعد بھی ہوتا ہے کہاں دشت تمام
اِس قدر جلد ہوئے جاتے ہو بیزارِ جنوں

ایسی وحشت بھی، یہ دہشت بھی نہیں تھی پہلے
ہم میں بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں آثارِ جنوں

مصلحت بیں تھے بہت میرے قبیلے والے
اک سوا میرے، نہ تھا کوئی طلبگارِ جنوں

غزل

زیست چار روز کی اِک حُباب کی طرح
ہم نے وہ گزار دی بس عذاب کی طرح

آئینے کے سامنے جھوٹ ہے کھڑا ہوا
عکس تکتا رہ گیا بس سراب کی طرح

روز و شب کی تختیوں کا حساب اک طرف
زندگی بسر ہوئی اک نصاب کی طرح

ہر غزل کے شعر میں عشق کا کمال ہے
شاعری رہی مری اکتساب کی طرح

رابطے ہوئے تھے یوں منزلیں بھی ایک تھیں
دھڑکنیں بھی بج اُٹھیں جب رُباب کی طرح

رازِ دل نہ کہہ سکا بن کہے وہ چل دیا
سوچتی میں رہ گئی ، اس کو خواب کی طرح

یہ کتاب زمن افروز ، خوشنما الگ تھلگ
نام ہے چھپا ہوا انتساب کی طرح

افروز رضوی

غزل

ہر طرف میرے طرفدار ہوا کرتے تھے
اچھے وقتوں میں بہت یار ہوا کرتے تھے

میں نے دیکھے ہیں بدلتے ہوئے لہجے ان کے
جو مرے حاشیہ بردار ہوا کرتے تھے

آج کل وہ بھی سرِ عام ہوا کرتے ہیں
جو تماشے پسِ دیوار ہوا کرتے تھے

چشمِ افلاک بھی حیران تو ہوتی ہو گی
یہ جو ویرانے ہیں گلزار ہوا کرتے تھے

کیا قیامت ہے کہ کاٹے گئے اس سے پہلے
پیڑ جس رُت میں ثمر بار ہوا کرتے تھے

یہ اصولوں کی نہیں بات مفادات کی ہے
وہ جو اُس پار ہیں اِس پار ہوا کرتے تھے

اب جو بازار میں کاسہ لیے بیٹھے ہوئے ہیں
ہاتھ ہوتے تھے تو معمار ہوا کرتے تھے

اب کے جو زخم لگا ہے وہ بہت کاری ہے
ورنہ پہلے بھی کئی وار ہوا کرتے تھے

تجھ کو وہ وقت کبھی یاد تو آتا ہو گا
دل شکن ہم ترے دلدار ہوا کرتے تھے

اس غمِ ہجر میں یہ کام نہ ہو گا یوسف
ان سے ملتے تھے تو اشعار ہوا کرتے تھے

افتخار یوسف

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کر لے نہ لکیروں میں گرفتار مجھے بھی
وہ ، نقش نہ کر دے سرِ دیوار مجھے بھی

غزل

اظہر عباس

میرے جیسی اداس تھی دُنیا
جب مرے آس پاس تھی دُنیا

حد سے بڑھ کر ملا نہیں کچھ بھی
مجھ کو اتنی ہی راس تھی دنیا

کچھ نہیں تھا ، جو تھا وہ تھا ہی نہیں
یعنی میرا قیاس تھی دنیا

مرتے دم تک مجھے نہ جان سکی
کس قدر ناشناس تھی دنیا

میری آنکھوں سے دیکھتا کوئی
کہ بہت بے لباس تھی دنیا

عام سی لگ رہی ہے آج ہمیں
تیرے ہونے سے خاص تھی دنیا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تنہائی سی تنہائی تھی ، کرتا بھی تو کیا میں
سو ، شہر میں صحرا کی طرح پھیل گیا میں

غزل

محبت کی ہری فصلیں کہاں اب تک کھڑی ہوں گی
اگر بے اعتباری کی ہوائیں چل پڑی ہوں گی

ہوا کے ہاتھ جب بھی گھونسلوں تک آ گئے ہوں گے
تو چڑیاں آندھیوں سے آخری دم تک لڑی ہوں گی

کسی سے عشق بھی کرتا ہوں اور یہ سوچتا بھی ہوں
یہ ایسا جُرم ہے جس کی سزائیں بھی کڑی ہوں گی

ہماری خواہش تقدیر سے دست و گریباں تھیں
بصد شوق بساط آخر کہاں تک یہ لڑی ہوں گی

جو شاخیں بادِ فصلِ گل کو ٹھکراتی رہیں قیصر
خدا جانے وہ کس موسم میں اب جا کر بڑی ہوں گی

قیصر مسعود

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بیٹھے ہیں دل میں خنجرِ حالات گھونپ کر
مظلوم تھے مگر بڑے سفاک ہو گئے

غزل

ہم ترے ہجر کے اسیروں میں
گھر گئے بے شمار تیروں میں

تُو چمکتا ہے میرے ماتھے پر
تُو مرے ہاتھ کی لکیروں میں

بے رُخی سے بھرے رویّے ہیں
اور ہے بےحسی ضمیروں میں

میں بھی رانجھا نہیں ہزارے کا
تُو بھی شامل نہیں ہے ہیروں میں

پھول رہ میں پڑے مسلتے ہو
دل بھی شامل ہیں راہ گیروں میں

ہم سزاوارِ جبر و اجر نہیں
ہم نہیں ہیں تیرے مشیروں میں

آپ عالی نسب ہیں مرشد جی
اور ہم لوگ ہیں حقیروں میں

ہم ہیں مرشد ترے ملنگوں میں
ہم ہیں مرشد ترے فقیروں میں

ہم ہیں راوی کے بے نوا باسی
پھر بھی ہیں تیرے ہم صفیروں میں

دل سے دل تک تری سفارت ہے
اور ہم ہیں ترے سفیروں میں

ہم بھی اصغر علی سخن ور ہیں
غالبوں میں ہیں اور نہ میروں میں

اصغر علی بلوچ

غزل

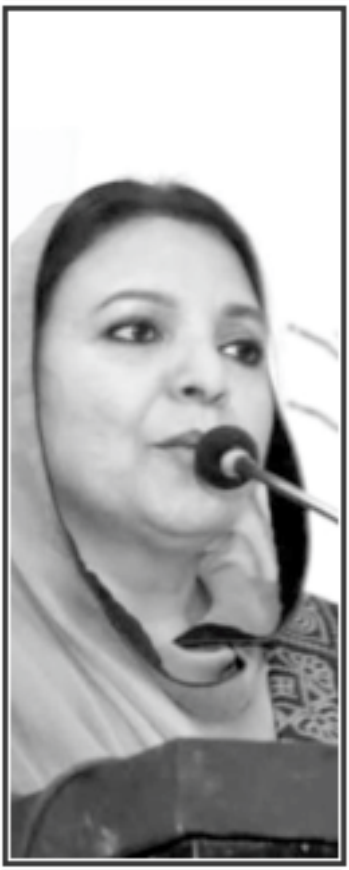

کچھ زندگی تو غم کی پناہوں میں کاٹ دی
جو بچ گئی وہ درد کی بانہوں میں کاٹ دی

ناکام و نامراد تھے منزل نہ مل سکی
ہم نے تمام عمر ہی راہوں میں کاٹ دی

عمرِ رواں اگرچہ ملی سب کو ایک بار
کچھ نے ہنسی میں، کچھ نے کراہوں میں کاٹ دی

کرتے ہیں تیرے ہجر میں یوں زندگی بسر
اشکوں میں دن ڈھلا تو شب آہوں میں کاٹ دی

تجھ سے بچھڑ کے ایسے کٹی عمرِ غم زدہ
رو کر گزار دی کبھی آہوں میں کاٹ دی

خالدہ انور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہم اُس گلی سے گزرتے ہیں سرسری خالد
اٹھا کے سر، دَر و دیوار دیکھ لیتے ہیں

غزلیں

دل کے سارے پشتے توڑ کے بیٹھے ہیں
ہم آنکھوں میں پانی چھوڑ کے بیٹھے ہیں

خشکی پر تیراکی کرنی پڑتی ہے
دریاؤں کا رخ کیا موڑ کے بیٹھے ہیں

عبداللہ بن ابی کے پیروکار یہاں
پھر کندھے سے کندھا جوڑ کے بیٹھے ہیں

دیواروں سے ماتھا پھوڑنے آئے تھے
ماتھے سے دیواریں پھوڑ کے بیٹھے ہیں

رفتہ رفتہ شام کے گہرے سائے پھر
دن کا سارا نور نچوڑ کے بیٹھے ہیں

نیند کا غلبہ بھی تو جیسے ملبہ ہے
پھر آنکھوں پر عینک اوڑھ کے بیٹھے ہیں

کیا مشکل ہے بیٹھیں بیٹھ کے بات کریں
آپ ابھی تک ہونٹ سکوڑ کے بیٹھے ہیں

مسعود احمد

کانٹے ہوئے ہمارے گلاب آپ کا ہوا
پوری طرح یہ دل تو جناب آپ کا ہوا

مجھ کو کسی گناہ کے کھاتے میں ڈال کر
کس نے کہا یہ سارا ثواب آپ کا ہوا

رکھنی ہے راہ رسم بھی کیا دھوکے باز سے
لے جائیں آج سے یہ چناب آپ کا ہوا

دنیا نے بار بار سراسر غلط کہا
دل نے کہا درست جواب آپ کا ہوا

جاتا نہیں ہے شام کو بھی اس منڈیر سے
سورج سے کیا حساب کتاب آپ کا ہوا

اچھا تھا جس قدر بھی اسے پیش کر دیا
جس نے کہا تھا سارا خراب آپ کا ہوا

دریا نے کیا دکھائی ہے دریا دلی ہمیں
دل کھول کر کہا یہ سراب آپ کا ہوا

لائی ہیں رنگ آپ کی یہ جی حضوریاں
فدوی ہیں پھر بھی سر کا خطاب آپ کا ہوا

غزل

عکس حسن و جمال تھا نہ رہا
آئینہ بے مثال تھا نہ رہا

وصل کی ایک شکل تھی نہ رہی
ہجر سے اتصال تھا نہ رہا

خواہش دید بھی نہیں اب تو
وہ جو مجھ میں کمال تھا نہ رہا

اس نے کیا جانے کیا کہا مجھ سے
میرا جو بھی خیال تھا نہ رہا

دشت میں راستہ ملا یعنی
سبز پتوں کا جال تھا نہ رہا

اشک آہوں میں ڈھل گئے عاصم
موسم برشگال تھا نہ رہا

عاصم اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اک شجر کے کوئی دو پتے بھی اک جیسے نہ تھے
میری دنیا میں کسی شے کا کوئی ثانی نہیں

غزلیں

جو زرنگار ہوا عشق، کیا محبت ہے
میں خود سے پوچھ رہا ہوں بھلا محبت ہے

زمیں پہ چلتے ہوئے بھی نظر فلک پہ رہے
فلک سے آتی رہی جو صدا محبت ہے

بروزِ حشر مرے پاس کچھ بھی ہوگا نہیں
یہی کہوں گا خدایا، خدا محبت ہے

معاملاتِ محبت، جمالِ دل ٹھہرے
یہی کہ اک ہے محبت ہی، یا محبت ہے

کہیں پہ شور زمانہ ہوا انیس احمد!
کہیں پہ چپ جو بنی ہے صدا محبت ہے

انیس احمد

سوچنا اپنے تئیں ہے مستقل فہرست میں
زندگی! رکھتی نہیں ہے مستقل فہرست میں

دوستوں کے ساتھ ہے میرا تعلق اس طرح
ایک اک دل میں مکیں ہے، مستقل فہرست میں

پانچ دس لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا ہے کائنات
یہ محبت جاگزیں ہے مستقل فہرست میں

اے محبت! اے حیاتِ جاودانی تیرا کام
بے ریا میری جبیں ہے مستقل فہرست میں

عشق! کیوں تم کو نظر آتا نہیں ہے میرا نام
دیکھ! لکھا تو یہیں ہے مستقل فہرست میں

مرتبے، اعزاز اور نام و نمائش نہ ملے
خامشی بولے کہیں ہے مستقل فہرست میں

دل کی دھڑکن سے زیادہ ہے انیس احمد تبھی
ذات اس کی خوش تریں ہے مستقل فہرست میں

غزل

جانِ من! آپ بڑے شوق سے روزہ رکھنا
عرض بس اِتنی ہے کچھ ہاتھ بھی ہولا رکھنا

روزہ کھایا بھی نہیں اور یہ فاقہ بھی نہیں
اس لئے سحری و افطاری کو سادہ رکھنا

پیش آ جائے کوئی مرحلہ مشکل جب بھی
سامنے سرورِ کونینؐ کا اُسوہ رکھنا

جس کا ہونا بھی نہ ہونے کے برابر ٹھہرے
ایسی دُنیا کے لئے کیسی تمنّا رکھنا

ایک درویش کا ہی ظرف ہے اتنا اعلیٰ
سر میں سودا نہ زباں پر کوئی شکوہ رکھنا

کوٹھیاں، بنگلے، پلازے ہوں مبارک تم کو
ذہن میں گور اندھیری کا بھی نقشہ رکھنا

دل دھڑکتا ہے تو دھڑکن سے صدا آتی ہے
یار کو یاد بہرحال ہمیشہ رکھنا

لاکھ چہرے بھی نظر آئیں شب و روز تمہیں
محورِ چشمِ وفا ، ایک ہی چہرہ رکھنا

بات کڑوی بھی کبھی کرنی ہی پڑ جاتی ہے
دوستو! لہجہء گفتار کو میٹھا رکھنا

شاعری کو نہیں اخبار بنانا فیضانؔ
کوئی مضمون بھی ہو ، شعر شگفتہ رکھنا

فیض رسول فیضان

غزل

دل میں بے تابی کا عالم کس لیے؟
نیند ہے راتوں کو کم کم کس لیے؟

کون بچھڑا ہے سرِ راہِ وفا؟
اس قدر ہے آنکھ پرنم کس لیے؟

زندگی کا کوئی تو مقصد بھی ہو
جی رہے ہیں آپ اور ہم کس لیے؟

جھوٹ بولیں ، ہوں جہاں میں کامیاب
سچ کہیں تو ساغرِ سم کس لیے؟

سوزنِ الطاف سے ہو گا رفو
زخمِ دل چاہے گا مرہم کس لیے؟

ہر کسی کی اپنی اپنی ہے غرض
شکوۂ بے دادِ ہمدم کس لیے؟

نام جب لیتے ہو شوکت عشق کا
دل نہ ہو وابستۂ غم کس لیے؟

شوکت محمود شوکت

غزل

کسی کی باتوں میں اے دوست آنے والے نہیں
ہم آسمان کو سر پہ اُٹھانے والے نہیں

وہ جن کا شہر میں شہرہ تھا دل چرانے کا
ہمارے دل کو تو وہ بھی چرانے والے نہیں

وہ جو کہے گا ہمیں ہو گا اس کا دل پہ اثر
ہم اس کی بات ہوا میں اڑانے والے نہیں

ہمارے ساتھ بُرا اس لیے بھی ہوتا ہے
کسی بھی بات کو ہم بھول جانے والے نہیں

سخن طراز مرے عہد میں ہیں جتنے بھی
کسی بھی طور یہ غالب کو پانے والے نہیں

ہوں ایک عمر سے دانش میں جن کا گرویدہ
مرے خیال کی دنیا بسانے والے نہیں

اعجاز دانش

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دیمکوں کے ہدف، کیوں نہ ہوں صف بہ صف
ہر ورق ایک سطرِ تپاں بھی نہیں

غزل

عون الحسن غازی

بلندی اور پستی سے جسے تو نے تراشا ہے
مجھے لینا ہے کیا اس سے، یہ دنیا تیری دنیا ہے

زمیں پر انتشارِ آدمیت بڑھ گیا ایسا
سنائی کیا مجھے دے، آسماں تک شور برپا ہے

سیاہی اس کے اندر کی کھرچ دے اپنے ہاتھوں سے
اندھیرے شہر سے مجھ کو بڑا ہی خوف آتا ہے

چھلکتی ہیں نگاہیں تو کوئی چشمہ اتارا اس پر
کسی بنجر ہوئے بادل کی صورت دل بھی پیاسا ہے

مجھے سونے کی خواہش ہے مگر میں سو نہیں سکتا
جو بن کر سو بھی جاؤں تو تصور جاگ اٹھتا ہے

جو سوچو تو محبت آگ ہے اور وہ بھی جنگل کی
اگر سمجھو تو دل کا راستہ دریا کو جاتا ہے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

لہو کی دھار نے تن روشنی میں ڈھال دیئے
سَروں کے ساتھ ہوا میں دیے اُچھال دیئے

غزل

ہزار بار یہ چاہا کہ فیصلہ ہو جائے
ڈھکا چھپا نہیں انکار برملا ہو جائے

اسی خیال میں سب دکھ چھپائے رکھتا ہوں
میں رو پڑوں تو کہیں وہ نہ غمزدہ ہو جائے

امید میں نے دھندلکوں سے باندھ رکھی ہے
کہ مجھ پہ صورتِ حالات آئنہ ہو جائے

میں ایک شرط پہ آمادۂ سفر ہوا ہوں
کہ منزلیں نہ سہی راستہ نیا ہو جائے

پتہ چلے گا کہ زندانِ عشق کیا شے ہے
وہ اپنی ذات کی جب قید سے رہا ہو جائے

اترنے لگتی ہے جب صحنِ زندگی میں شام
تو اپنا سایہ بھی ہم سے گریز پا ہو جائے

دکھا سکوں نہ چھپا پاؤں کیسی مشکل ہے
جو زخم بھرتا نہیں ہے تو پھر ہرا ہو جائے

دکھوں سے لاکھ بنا کر رکھو مگر جاذب
کہیں غزل نہ بہ اسلوبِ مرثیہ ہو جائے

اکرم جاذب

غزل

مرتے مرتے روشنی کا خواب تو پورا ہُوا
آ گیا ہے لوٹ کر اپنا کوئی بچھڑا ہوا

اِس طرح پڑھتے ہیں چہرے کو تری بستی کے لوگ
ہو مرے چہرے پہ جیسے واقعہ لِکھا ہُوا

نیند سُولی پر بھی آ جاتی ہے لوگوں کو تو پھر
اور کب تک جاگتا میں عُمر کا جاگا ہُوا

میری آنکھوں میں ہیں آنسو یا مُقدّر کی ہے چال
شہر ہے سارے کا سارا دُھند میں لِپٹا ہُوا

کیا قیامت ماؤں پر گزری، کروں کیسے بیاں
اپنے بچوں کو جو دیکھا خُون میں ڈوبا ہُوا

غم بھی آئے تو اُسے بڑھ کر لگا سینے سے تُو
ہے تری قسمت میں شاہد بس یہی لکھا ہُوا

ہمایوں پرویز شاہد

غزل

اس قدر اُن سے اگر ملنے ملانے لگ جائیں
یہ نہ ہو ہم سے وہ نظریں ہی چُرانے لگ جائیں

روشنی ہاتھوں میں لیتے ہوئے ڈر لگتا ہے
خود کو ہم پھر نہ کہیں خواب دکھانے لگ جائیں

تم بھی لوگوں سے رہ و رسم بڑھا کر دیکھو
کہ تمہارے بھی ذرا ہوش ٹھکانے لگ جائیں

یہ بھی ہو سکتا ہے جس گھر کی بہت خواہش ہے
جب ملے خود ہی اُسے آگ لگانے لگ جائیں

کبھی تو شاخِ طلب زرد رُتوں میں نکلے
کبھی اِس پیڑ پہ پتے بھی تو آنے لگ جائیں

کاش اِس بار وہ بارش ہو کہ جل تھل ہو جائے
اور کُھلے صحن میں ہم ناچنے گانے لگ جائیں

اِس لیے راہِ گزشتہ سے گزرتا ہی نہیں
پھر وہ آوازیں کہیں مجھ کو نہ کھانے لگ جائیں

اب کے ممکن ہے ستارے ہوں سرِ عرش ظہور
اور مرے ساتھ ہی وہ آنسو بہانے لگ جائیں

ظہور چوہان

غزل

میتھیو محسن

پڑھنا آنکھوں کی زباں جانتے ہیں
ہم ترے دل کا جہاں جانتے ہیں

جن کے لب پر تھا مرا نام سدا
اب مرا ذکر گراں جانتے ہیں

تیر آئے ہیں کہاں سے دل پر
ہاتھ کس کے تھی کماں جانتے ہیں

بحر مواج سے لڑنے والے
کیا ہے طوفاں میں نہاں جانتے ہیں

ضبط کا ایک قرینہ ہے غزل
اور آپ اس کو فغاں جانتے ہیں

وہ بھی اظہار کرے یا نہ کرے
ہم تو اُس کو رگ جاں جانتے ہیں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یہ سفر ، سَر بہ سَر رائیگاں بھی نہیں
کارِ دل محض کارِ زیاں بھی نہیں

غزل

گزارے لائق یہ عشق یارا کیا ہوا ہے
کسی نے آدھا کسی نے سارا کیا ہوا ہے

یہ کس زمیں پر پرانی اینٹیں لگا رہے ہو
ہماری مٹی کا تُم نے گارا کیا ہوا ہے

خموشیوں کی صلیب پر وہ دمکتے چہرے
کسی نے پھیکا چمن کو کھارا کیا ہوا ہے

یہ ہار دیگر کا سلسلہ بھی فریب جیسا
شکستگی نے جنوں کو پارا کیا ہوا ہے

یہاں پرندوں سے گفتگو کا یہی ہے مطلب
خُدا سے بخشش کا ایک چارا کیا ہوا ہے

شکایتوں کے سفر پہ نکلے نصیب روئے
ہمی کو ہلکا ہمیں ہی بھارا کیا ہوا ہے

ازل سے قائم حکومتوں کے یہ تاج امجد
کوئی ہے قاروں کسی کو دارا کیا ہوا ہے

امجد بابر

غزل

شہرِ اجداد کو بہت روئے
خستہ بنیاد کو بہت روئے

دستیابی کے بعد ہم دونوں
لذتِ یاد کو بہت روئے

خالی جھولی کو دیکھ کر عاصی
پھیکی فریاد کو بہت روئے

پیڑ پنچھی کھلا ہوا پنجرہ
بوڑھے صیاد کو بہت روئے

اک مصیبت ہے یہ رہائی بھی
قیدی آزاد کو بہت روئے

کھلکھلائے نجف کی گلیوں میں
اور بغداد کو بہت روئے

جس کا بازار آنا جانا ہو
مولا سجاد کو بہت روئے

اسد رضا سحر

غزل

خدا سے لو لگاتے ہیں
جو سورج کو جگاتے ہیں

بہت غمگین ہوتے ہیں
جو اوروں کو ہنساتے ہیں

دل و جاں جن پہ واریں ہیں
وہی ہم کو ستاتے ہیں

بھلا کیا نام ہے ان کا
ہمارے دل میں آتے ہیں

چلے آؤ محبت سے
تمھیں چائے پلاتے ہیں

کبھی تو لوٹ کر آؤ
تمھیں منظر بلاتے ہیں

ہمیں کیا سچ بتائیں گے
قسم جھوٹی وہ کھاتے ہیں

مزہ لیجے منانے کا
نبیل ان کو مناتے ہیں

نبیل قیصر

غزل

کیوں نہیں راس یہ خلوت تم کو
ہر کسی سے ہے شکایت تم کو

زندگی یوں بھی گزر جاتی ہے
کیوں کسی کی ہے ضرورت تم کو

کل اسی وقت کو تم ترسو گے
آج ملتی نہیں فرصت تم کو

بات ہے تلخ مگر سچی ہے
کر گئے کب کے وہ رخصت تم کو

جتنا بھی سچ ہے چرا لو آنکھیں
کرنی پڑ جائے گی ہجرت تم کو

جو ہوا بھول گئے ہو کیا تم؟
اب بھی ملنے کی ہے حسرت تم کو؟

نائلہ راٹھور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ایک جھلمل سا نگر چھوڑ دیا جاتا ہے
تر ، فقط دیدۂ تر چھوڑ دیا جاتا ہے

غزل

آئنہ اوڑھ کے جھوٹوں سے ملا کرتا تھا
میں ہی تھا سچ کی جو آواز بنا کرتا تھا

وقت نے رشتوں کی پہچان بدل ڈالی ہے
غیر جو آج ہے ، وہ اپنا ہوا کرتا تھا

ہائے وہ تجزیہ گر، آج بھی ہے یاد مجھے
آپ بیتی کو جو افسانہ کہا کرتا تھا

تو نے مجھ کو بھی بنا ڈالا ہے اپنے جیسا
ورنہ میں وہ تھا کہ ہر اک سے وفا کرتا تھا

دستکیں دینے پہ بھی کھلتا نہیں ہے اب تو
چاپ سے میری جو دروازہ کھلا کرتا تھا

اہلِ دنیا کی نظر میں تھا میں تنہا لیکن
خوف مرنے کا مرے ساتھ رہا کرتا تھا

دل محبت کے تقاضوں سے تھا مجبور نوید
ظلم سہنے کی یہ ہر بار خطا کرتا تھا

نوید عاجز

غزل

رات کا پچھلا پہر، سرد ہوا، خالی سڑک
دل کو بھاتی ہے اداسی کی فضا خالی سڑک

چاندنی رات کی وحشت میں کہاں جاؤں گا میں
شہر بھر میں ہے مری ایک ہی جا خالی سڑک

کیا بتاؤں میں تجھے کتنا اکیلا ہوں میں
میری تنہائی کو سینے سے لگا خالی سڑک!

جانے انجانے کئی لوگ مِلے ہوں گے تجھے
مجھ سا تنہا بھی کوئی تجھ کو ملا خالی سڑک

شاید آ جائے کوئی، مل کے صدا دیتے ہیں
میری آواز میں آواز مِلا خالی سڑک

کہیں جانا ہے مگر جانے کہاں جانا ہے
مجھے معلوم نہیں تُو ہی بتا خالی سڑک

تھک گیا ہوں میں بہت اور چلا جاتا نہیں
اپنے پہلو میں کہیں مجھ کو بٹھا خالی سڑک

پتّیاں سُرخ گلابوں کی گریزاں ہیں بہت
مجھ پہ سُوکھے ہوئے پتّے کی اُڑا خالی سڑک

کوئی پہچانے نہ پہچانے زمانے میں امر
جانتی ہے مرے قدموں کی صدا خالی سڑک!

امر مہکی

غزل

ایک ہی در سے اور خدا کا در
بند ہوتا نہیں دعا کا در

آپ کا در تو آپ کا در ہے
اب یہی ہے مری بقا کا در

چھوڑ دی تخت و تاج کی چاہت
جب سے مجھ کو ملا عطا کا در

زخم گہرے تھے جب سبھی دل کے
عشق سے ہی کھلا شفا کا در

دونوں مجھ پر کھلے ہی رکھتا ہے
زخم کا در بھی اور دوا کا در

امجد خان تجوانہ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

نسبتِ قیس بنی آخری تنکا خالد
بارِ محمل نہ اُٹھا ناقۂ دانائی سے

غزل

نم زدہ، نین کنارے نہیں دیکھے جاتے
ہم سے، دکھ درد کے مارے نہیں دیکھے جاتے

عزم لڑتا ہے، اُبلتے ہوئے طوفانوں سے
بحرِ ہمت میں، کنارے نہیں دیکھے جاتے

دیکھ سکتا ہوں، دہکتا ہوا سورج، لیکن!
تیری پلکوں پہ ستارے نہیں دیکھے جاتے

یہ تجارت ہے، محبت کی تجارت، جس میں
گوشوارے یا خسارے نہیں دیکھے جاتے

شوق بے باک ہی دیتا ہے سنبھالا بڑھ کر
رزمِ ہستی میں سہارے نہیں دیکھے جاتے

آؤ جمشید! نگاہوں کو چڑھا دیں سُولی
صحنِ گلشن میں انگارے نہیں دیکھے جاتے

دیکھ لیتے ہیں جو خوش ذوق، مرا پاک وطن
ان سے پھر 'بلخ' بخارے نہیں دیکھے جاتے

جمشید کمبوہ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

راستے بھر کیا یونہی ہم کو پکارے جائیں گے
ساتھ دریا کے کہاں تک یہ کنارے جائیں گے

غزل

گر شیر شاہِ وقت نے مہلت تمام کی
تاخیر ہو ، مجال کہاں پھر غلام کی

اک جام سرخ، باغ میں اُس ماہ رو کے ساتھ
تفہیم کر رہا ہوں رباعی خیام کی

سنتا تو ہو گا شور میں کوئی صدا شناس
طرزِ سخن پہ مہر ہے شاعر کے نام کی

خوش رُو مشین زاد تو موجود ہیں مگر
رونق کہاں گئی در و دیوار و بام کی

دیکھا جہاں پہ اس کو شکستہ سپر کے ساتھ
میں نے بھی تیغِ تیز وہیں پر نیام کی

پانی پیا تو کان میں گونجی وہی صدا
''پیاسو سہیل ہے یہ شہیدوں کے نام کی''

عابد رضا

غزل

اِسی لیے تو میں تیرے قریں نہیں آتا
ڈرے ہوؤں کو کسی پر یقیں نہیں آتا

یہ میرا دل ہے کہ آسیب میں گھرا ہوا گھر
کہ اِس مکان میں کوئی مکیں نہیں آتا

وہ بے نیاز ہے لیکن ذرا سا ضدی ہے
یہیں پہ آنا ہے اُس کو ، یہیں نہیں آتا

یہ میرے نام سے منسوب داستانِ حیات
کہ میرا نام ہی جس میں کہیں نہیں آتا

تمھارے واسطے جس طرح کے نظارے ہیں
کسی کو خواب بھی اِتنا حسیں نہیں آتا

ہم ایسے روندے ہوئے در کی طرح ہیں کہ جہاں
قدم ہی آتے ہیں نقشِ جبیں نہیں آتا

ہزار سانپ بھلے آستیں میں ہیں تیمور
مِرا لہو تو سرِ آستیں نہیں آتا

سید تیمور کاظمی

غزل

گردشِ وقت نے ایسا الجھا دیا، تیرے دیدار کی تشنگی چھین لی
دل کو سیراب غم نے کچھ ایسے کیا جو بھی بنتی جگہ تھی تری، چھین لی

میں نے اُس کو کہا تیری آواز کانوں میں جب بھی پڑی زندگی بڑھ گئی
اُس نے اِتنا سُنا تھا کہ چُپ سادھ لی اور مجھ سے مری زندگی چھین لی

دفترِ عشق میں جب مرا دل ہوس کے اصولوں پہ خود کو چلانے لگا
تب خدائے محبت نے مجھ سے کہا جا کہ تجھ سے تری نوکری چھین لی

میں محبت کے قابل سمجھتا اُسے جو پری زاد تھی، مثلِ مہتاب تھی
بس اِسی ضد نے مجھ سے مرے چاہنے والی ہر دوسری سانولی چھین لی

اِس پہ غمگین ہونے کی کیا بات ہے اُس کی مجھ سے توجہ اگر ہٹ گئی
اِس پہ بنتا نہیں اُس سے شکوہ کروں، اُس کی شئے تھی، وہی واپسی چھین لی

ثمر جمال

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

صبح عروج کی راہ نہ لگنا، شام زوال نہ کرنا
عشق سفر کرنا، لیکن سورج کی چال نہ کرنا

غزل

جایئے! جی جایئے، ہم کو رلاتے جایئے
دل میں رکھ کے نفرتیں، بس مسکراتے جایئے

جی کے ہم دکھلائیں گے اب، بے سروسامان ہی
جاتے ، جاتے اپنا یہ، احساں اٹھاتے جایئے

راہ میں اٹکاتے ہیں روڑے، ہمیشہ ہی اپنے
رشتے داروں سے ذرا، دام بچاتے جایئے

ایک چھوٹا بچہ، ہوتا ہے ، فرشتہ مان لو
مسکراہٹ پر اسی کی، جاں لٹاتے جایئے

ہے شکستہ دل یہاں، ہر شخص ہی اب کیا کریں
کچھ نہیں تو ، ان کو تھوڑا سا ہنساتے جایئے!

بندگی کے کوکی! پورے ہوں تقاضے بھی سدا
زندگی میں رب کے فرماں، نا بھلاتے جایئے

کوکی گل

غزل

زندگی کیا ہے ، شام تنہائی
راہ بھولا ہوا میں رسوائی

عشق میں ایسی رہ گزر پر ہوں
چھوڑ جاتی ہے جب یہ تنہائی

ہجر میں آپ کے یہ جانا ہے
جان لیوا ہے یار تنہائی

میں اسے دیکھتا ہوں چھپ چھپ کے
وہ مگر غیر کا تمنائی

منتظر آج بھی ہوں میں اُسکا
پر نہ واپس وہ لوٹ کر آئی

اپنا مرنا تو طے ازل سے تھا
پیچھے دریا تھا ، سامنے کھائی

اشک جب مستقل مکین رہے
آنکھ میں جم گئی مرے کائی

مرحلہ وار مر گیا شاہد
میں تماشا تھا ، وہ تماشائی

رانا محمد شاہد

غزل

نہ سہی چاند، مجھے کوئی ستارا تو کرے
ایک پل کو ہی سہی جان سے پیارا تو کرے

میں اُسے اپنے لیے پھر سے تڑپتا دیکھوں
ایک حسرت ہے کہ وہ عشق دوبارا تو کرے

وہ مجھے ٹوٹ کے نہ چاہے نہیں ہے حسرت
وہ مرے ساتھ محبت میں گزارا تو کرے

اس قدر ہجر میں افسردگی اچھی تو نہیں
لمحوں کو سہی خود کو سنوارا تو کرے

جاں نچھاور نہ یہ کر دیں تو ہمیں کہنا پھر
مہدیؔ خود کو وہ کسی روز ہمارا تو کرے

غضنفر مہدی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چاند کیا جل بجھے ستارے بھی
ہو گئے خوں یہ استعارے بھی

غزل

اک شخص کو پڑی تھی ضرورت خلوص کی
گلیوں میں دھجیاں تھیں محبت، خلوص کی

دنیا نے جس پہ جھوٹ کی تہمت لگائی تھی
وہ کیسے نقل کرتا روایت خلوص کی

چلمن پہ اختیار نے پہرہ بٹھایا تھا
محشر اُٹھا رہی تھی شرافت خلوص کی

خواہش سراب ، آئنہ بیزار ، سختیاں
روز ازل سے ہے یہی قسمت خلوص کی

اک حاشیہ نشین کا بانکا خیال تھا
طولِ شبِ فراق اذیت خلوص کی

کالج، سکول ، مدرسہ، گاؤں ، مکان میں
عادل مجھے نہیں ملی سنگت خلوص کی

عزیز عادل

غزل

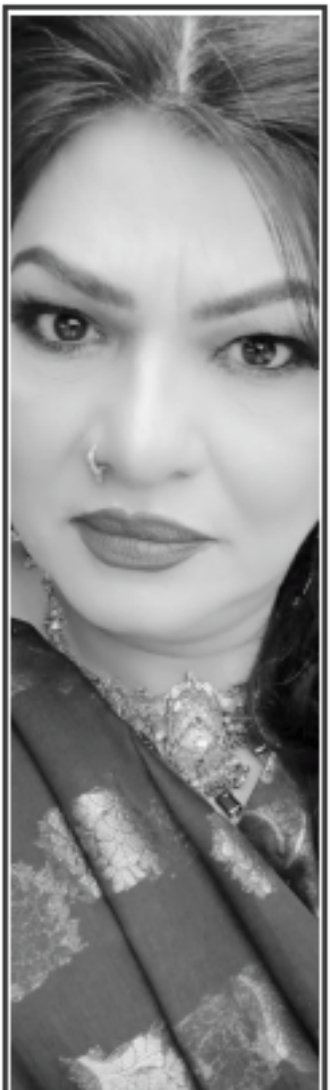

اچھی کسی کے دل کو لگی مدتوں کے بعد
میں آج کھلکھلا کے ہنسی مدتوں کے بعد

آنگن میں لوٹ آئے بہاروں کے ولولے
محفل کسی کے دم سے سجی مدتوں کے بعد

لہروں کی چھیڑ چھاڑ نے باندھا عجب سماں
اک جلترنگ بجنے لگی مدتوں کے بعد

خوشبو نے سارے شہر کو گھیرے میں لے لیا
رنگوں سے آبشار بنی مدتوں کے بعد

رقصاں ہوا ہے صحنِ چمن ، ساز بج اٹھے
مجھ پر تری نگاہ پڑی مدتوں کے بعد

حسرت سے سن رہے ہیں حریفانِ خوش خیال
کیسی غزل یہ میں نے کہی مدتوں کے بعد

رکھتی بھی کیا حسابِ مہ و سال میں جیا
صدیوں پہ غالب آئی گھڑی مدتوں کے بعد

جیا قریشی

غزل

دن طلوع ہو نہ اگر شام دوبارہ کرنا
کتنا دلکش ہے اندھیرے میں نظارہ کرنا

غم تو ہوتا ہے بہت گہرا سمندر کی طرح
ڈوب نہ جانا کہیں اس میں کنارا کرنا

درد بن کہ وہ مکیں ہے میرے دل میں اب تک
درد دل کا میرے اے چارا گرو چارہ کرنا

خود سے نکلو تو نکل آئے گا رستہ کوئی
ورنہ مشکل ہے بہت گھر میں گزارا کرنا

وہ بھی کیا دن تھے میری جان کہ جب شام و سحر
چاند چہرے کو تو آنکھوں کو ستارہ کرنا

دل میں بس کر بھی جو آنکھوں سے سدا دور رہا
تھا مقدر میں اذیت یہ گوارا کرنا

ہم تمھارے ہیں دل و جان سے اے جان وفا
اب دل و جان سے تم خود کو ہمارا کرنا

ہم کسی کام میں کل کے نہیں قائل اشفاق
کام جو کرنا ہے وہ آج ہی سارا کرنا

محمد اشفاق بیگ

غزل

نہ دشت ہی میں کہیں اور نہ آشیانے میں
سکوں مل نہ سکا ہم کو اس زمانے میں

وقار جن ملا کو ہم سے بارہا ، وہی لوگ
ہمیں دکھائی دے بجلیاں گرانے میں

اب آئے ہو تو یہ جانے کی کیسی عجلت؟
کہ وقت چاہیے سننے اور سنانے میں

سمجھ میں آتا نہیں ہم نے کیا بگاڑا تھا
لگے ہوئے ہیں وہ ہر دم ہمیں مٹانے میں

وہ جن کے ہاتھ میں تھا نظم کائنات یہاں
جتے ہوئے ہیں ، وہی اب اسے گرانے میں

وہ ناز جن کی وفاؤں پہ تھا ہمیں خالق
لگے ہوئے تھے ہماری ہنسی اڑانے میں

خالق آرزو

غزلیں

تاریکیوں میں اپنا حوالہ بناؤں گا
میں رات کو جلا کے اُجالا بناؤں گا

تاکہ نگاہِ ساقیءِ کوثر میں آ سکوں
خاکِ شفا کو گوندھ کے پیالہ بناؤں گا

میں ماتمِ حسینؑ کی ہر ایک ضرب کو
قتلِ یزید عصر کا آلہ بناؤں گا

گریہ کرے گی آنکھ نہ شکوہ کرے گا دل
میں دُکھ کو ایسا دیکھنے والا بناؤں گا

دم توڑ دیں گی آندھیاں ٹکرا کے میرے ساتھ
میں اپنے حوصلے کو ہمالہ بناؤں گا

صورتِ عشق میرے یار بنائی میں نے
یعنی ترتیب سے رکھ دی ہے خدائی میں نے

پھول سے میری ملاقات حقیقت نہیں ہے
اپنے بارے میں اُڑائی ہے ہوائی میں نے

قیس نے ہجر کا مضمون پڑھا ہے مجھ سے
اتنے نزدیک سے دیکھی ہے جدائی میں نے

اپنی آنکھیں مرے مصروں میں پڑی چھوڑ گئے
کچھ غزالوں کو غزل ایسی سنائی میں نے

اس کے حصے کی ندامت کو اٹھا کر ناصر
آنکھ میں آئی نمی مر کے چھپائی میں نے

ناصر علی ناصر

غزل

چمن کا غنچہ و گل ہوں، فلک کا تارا ہوں
امینِ عشق، دیارِ وفا میں یکتا ہوں

ہوائے رنج نے مرجھا دیا دلِ خنداں
تباہ حال ہوں ، ویرانیوں کا چہرا ہوں

مری جھلک سے مرادوں کو مانگنے والو!
کسی کے بخت کا ٹوٹا ہوا ستارا ہوں

جو عورتیں ہیں مرے ساتھ اپنا حق مانگیں!
میں اپنے عہد کی آواز ہوں، حوالا ہوں

کسی کے بخت میں بابا نہ باندھنا مجھ کو!
تمھاری لاڈلی بیٹی ، تمھاری گڑیا ہوں

زباں دراز مجھے کہہ رہے ہو، کہتے رہو
غلط، غلط ہی کہوں گی کہ میں بھی دانا ہوں

بقائے دہر ہے مسکان گل وجود مرا
ہوائے شہرِ طرب کا حسین جھونکا ہوں

مسکان گل

اُردو شاعری میں صوتی اور صُورتی قوافی کا مسئلہ

قافیے کی اصل بنیاد تو صوت ہی ہوتی ہے۔ شاعری تو عبارتی زبان کی ابتدا سے پہلے بھی ہو رہی تھی۔ اس کا تعلق بولنے اور سننے کے ساتھ تھا۔ چنانچہ ہم صوت الفاظ یا حروف اور ان کی حرکات کی ہم آوازی ہی قافیے کا واحد جواز تھا۔ اور لکھی ہوئی زبان میں بھی قافیے کا یہی جواز چلتا رہا۔ اور اردو نے بھی الفاظ کی صوتی ہم آہنگی کو ہی قافیے کی بنیاد بنایا ہے۔ صوتی اعتبار سے مختلف ہم صوت یا ہم حرکات الفاظ بھی قافیہ بن سکتے ہیں جیسے ناراض، ساز، شاذ، لحاظ سے کے الفاظ کے حروف مختلف ہیں مگر ہم اردو میں ان کی ادائیگی میں آوازوں کا کوئی فرق نہیں کرتے۔ یا جیسے باس، خاص، اناث۔ اسی طرح بات اور شالاط کو بھی قافیہ بنایا جاسکتا ہے۔ اس کے برعکس ایک جیسے حروف کے باوجود اعراب کے اختلاف کی بنا پر ہم صوت الفاظ قافیہ نہیں کہلا سکتے کیونکہ حروف کی حرکات کے بدلنے سے صوت بدل جاتی ہے۔ جیسے دَور، دُور، شور اور صَور سب صورت سے ایک جیسے الفاظ ہیں؛ یعنی سب میں (و) اور (ر) کے حروف مشترک ترتیب میں استعمال ہوئے ہیں مگر (و) سے پہلے والے حرف کی اعرابی تبدیلی اور صَور میں خود (و) کی اعرابی تبدیلی کے ساتھ صوت تبدیل ہو جاتی ہے لہٰذا یہ الفاظ صوتی ہم آہنگی کی شرط پوری نہ کرنے کے باعث ہم قافیہ نہیں ہو سکتے۔ اردو کی شعری روایت میں بھی اصولی طور پر الفاظ و حروف کی صوتی ہم آہنگی کو ہی قافیے کی بنیاد بنایا گیا ہے۔ البتہ استثنائی طور پر کبھی کبھی کچھ شاعروں کے ہاں صورتی قوافی کے استعمال کی مثالیں بھی مل جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر میر کے یہ اشعار دیکھیے:

گرچہ سردار مزوں کا ہے امیری کا مزہ
چھوڑ لذت کے تئیں لے تو فقیری کا مزہ

لوہو پیتے ہی مرا اشک نہ منھ کو لاگا
بوسہ جب لے ہے ترے ہونٹ کی بیری کا مزہ

.....

گلیوں میں جب تک تو مذکور ہے ہمارا
افسانۂ محبت مشہور ہے ہمارا

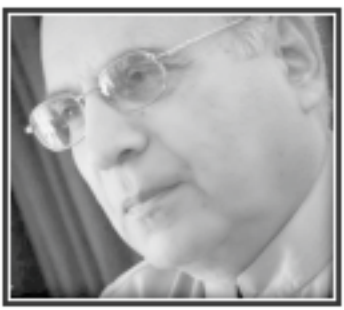

جلیل عالی

مقصود کو تو دیکھیں کب تک پہنچتے ہیں ہم
بالفعل اب ارادہ تا گور ہے ہمارا

....

اس بے گنہ کے قتل میں اب دیر مت کرو
جو کچھ کہ تم سے ہو سکے تقصیر مت کرو

....

دلی میں اب کے آکر ان یاروں کو نہ دیکھا
کچھ وے گئے شتابی کچھ ہم بھی دیر آئے
کیا خوبی اس چمن کی موقوف ہے کسو پر
گل گر گئے عدم کو ٹکڑے نظیر آئے
شکوہ نہیں جو اس کو پروا نہ ہو ہماری
دروازے جس کے ہم سے کتنے فقیر آئے
عمر دراز کیونکر مختار خضر ہے یاں
اک آدھ دن میں ہم تو جینے سے سیر آئے

....

ان قوافی کو دیکھ کر یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ امیری، فقیری اور پیری؛ مذکور، مشہور اور گور؛ خیر اور تقصیر؛ دیر، سیر، نظیر اور فقیر کے قوافی میں صوت کے بجائے لفظ کی املائی ہم صورتی کو بنیاد بنایا گیا۔ یعنی صرف بصری مماثلت کو کافی جانا گیا ہے۔ اس میں قافیے کی اصل بنیاد (صوتی ہم آہنگی) سے انحراف کیا گیا۔ اگر اسے اس زمانے میں گوارا بھی کر لیا گیا ہو تو یہ الگ بات ہے، قافیے کی صوتی شرط تو پوری نہ ہو سکی۔ اس لیے یہ انحراف تسلسلِ روایت کا حصہ نہ بن سکا۔ غالب نے بھی ایک آدھ غزل میں جو اردو کی روایت سے ہٹ کر قوافی باندھے اور طرف دارانِ غالب کی جانب سے ان الفاظ کا جو صوتی جواز فارسی یا پنجابی زبان میں صوتی ادائیگی سے لایا جاتا ہے وہ اس لیے زیادہ جان دار نہیں ہے کہ ہر زبان دوسری زبانوں سے مستعار لیے ہوئے الفاظ کا جو تلفظ اختیار کر لیتی ہے وہی معیار ٹھہرتا ہے۔ جیسے عربی دوسری زبانوں کے الفاظ کی تعریب کر لیتی ہے اور فارسی تفریس کر لیتی ہے ویسے ہی اُردو جن لفظوں کی تارید کر لیتی ہے وہی تلفظ رواج پا جاتے ہیں۔ پھر ان اردوائے ہوئے الفاظ کا اوریجنل تلفظ با حوالہ نہیں رہتا۔

جیسے ہندی کا سُورج اُردو میں سُورَج ہو گیا، مَتر، مَتَر ہو گیا اور عربی کا جَذْبَہ، جَذَبَہ ہو گیا۔ اس لیے اغلب یہ ہے کہ غالب نے بھی میر کی طرح صوتی کے بجائے صورتی قوافی ہی برتے ہوں۔ اس نکتے کی وضاحت کے لیے غالب کی یہ غزل دیکھیے:

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا
نہ ہوئی ہم سے رقم حیرتِ خطِ رخِ یار
صفحۂ آئنہ جولاں گہِ طوطی نہ ہوا
سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا
یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا
میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا
دل گزرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی
گر نفَس جادۂ سر منزلِ تقویٰ نہ ہوا

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی
گوشِ منت کشِ گلبانگِ تسلّی نہ ہوا
کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجیے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں، سو وہ بھی نہ ہوا
وسعتِ رحمتِ حق دیکھ کہ بخشا جائے
مجھ سا کافر کہ جو ممنونِ معاصی نہ ہوا
مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالب
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

.....

اس غزل میں تقویٰ اور عیسیٰ کے قوافی بھلے فارسی میں عیسی اور تقوی کی صوت میں بھی رائج ہوں مگر اردو روایت میں ان کا یہ تلفظ متداول نہیں ہے، مگر کسی زمانے میں صورتی قوافی کے عارضی رجحان کے تناظر میں ان قوافی کو صورتی قوافی تصور کریں تو یہ جواز نسبتاً قرینِ قیاس ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں غالب کی ایک اور غزل دیکھیں:

عشق تاثیر سے نومید نہیں
جان سپاری شجرِ بید نہیں
سلطنت دست بدست آئی ہے
جامِ مے خاتمِ جمشید نہیں
ہے تجلی تری سامانِ وجود
ذرہ ہے پرتوِ خورشید نہیں
رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے
ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں
گردشِ رنگِ چمن سے ڈر ہے
غمِ محرومیِ جاوید نہیں
کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

صوتی حوالے سے دیکھا جائے تو اس غزل کے مطلع ہی سے طے ہو جاتا ہے کہ نومید، خورشید اور امید کو بید اور بھید کی صوت پر باندھا گیا ہے۔ اب اگر فارسی میں خورشید، نومید اور امید کے الفاظ کا بید اور بھید کی صورت پر باندھنا بھی روا ہو تو ان کی یہ صوت اردو میں متداول نہیں ہے۔ لہٰذا صوتی قوافی کے اعتبار سے یہ دلیل اتنی برمحل نہیں رہتی۔ البتہ یہاں بھی غالب امکان یہی ہے کہ غالب نے صورتی قافیے کے رجحان ہی میں ایسا کیا ہو۔ چنانچہ یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ غالب مخالف اصحاب نے بھی صورتی قوافی کے اس عصری رجحان کے پیشِ نظر غالب کے ایسے انحرافات پر انگلی نہ اٹھائی ہو۔ البتہ ہم دیکھتے ہیں کہ قوافی کی اصل صوتی بنیاد سے ہٹا ہوا صورتی قوافی کا یہ رجحان زندہ اردو شعری روایت کا حصہ نہیں بن سکا۔ اس کے برعکس جواز، ناراض، الفاظ اور شاذ؛ احساس اور خاص: ثبوت اور حنوط کے صوتی قوافی باندھے جا رہے ہیں۔ اس لیے کہ اردو میں ز، ض، ظ اور ذ؛
س اور ص؛
ط اور ت کی آوازوں میں فرق نہیں کیا جاتا۔ ہر زبان کی اپنی روایت اور مزاج ہوتا ہے۔ کسی ایک زبان پر دوسری زبان کے اصول لاگو نہیں کیے جا سکتے۔

☆☆☆☆☆

نسیمِ سحر: ''پہلی اُڑان'' سے ''جادو بھری شام'' تک

۱۵ فروری ۱۹۴۴ء میں نسیمِ سحر کی ذاتی نقاب کشائی کے تینتیس برس بعد اُس کی تحریری نقاب کشائی جنوری ۱۹۷۷ء میں شائع ہونے والے اولین مجموعۂ کلام ''پہلی اُڑان'' کے توسط سے ہُوئی۔ آغازِ سفر سے ہی ذات کے حوالے سے اجتماعی مسائل کو بغور دیکھنے، پرکھنے اور اپنی شاعری کا موضوع بنانے کا رویہ اُس کے ہاں نظر آنے لگا تھا۔ اِسی رویے نے اُس کو اپنے عہد میں رہتے ہُوئے ماضی کی تصویر کشی اور مستقبل کی دھندلی عکس بندی کا سلیقہ عطا کیا جس کے تحت وہ اپنی سوچ سے گونا گوں جذبوں کی ترجمانی کرتا اور الفاظ کو دورِ جدید کے نئے ذائقوں سے متعارف کراتا ہُوا ذات کے نہاں خانوں سے کائنات کے حیرت کدوں کی طرف لپکتا ہُوا دکھائی دینے لگا۔ ۱۹۸۲ء میں اُس کا دُوسرا شعری مجموعہ ''ہر بوند سمندر'' منظرِ عام پر آیا جس نے سخن فہم اور سخن شناس حلقوں میں اُس کی آمد کو مستحکم کیا اور بطور ایک غزل گو اُس کی حیثیت کو مستند قرار دیے جانے کے لائق بنایا۔ اِس مجموعہ میں اُس کی شاعری کے خدوخال اور رنگ روپ واضح ہُوئے اور وہ گروہِ سخن وراں میں ایک محترم مقام حاصل کرنے میں کامیاب دِکھائی دینے لگا۔ اُس کا تیسرا مجموعہ ''دریچۂ شب'' ۱۹۸۹ء میں سامنے آیا جو اُس کی نظموں پر مشتمل تھا۔ بقول سید ضمیر جعفری یہ کتاب ''قدرتِ بیان کے ساتھ ندرتِ اظہار میں بھی منفرد'' ثابت ہُوئی۔ نسیمِ سحر کی منظومات میں زندگی کے بے شمار رُخ نظر آتے ہیں۔ کوئی نظم مانوس فضا اور دیکھے بھالے گرد و پیش کا منظر دکھاتی ہے اور کوئی اجنبی ماحول کی مایوسی اور قنوطیت کی تصویر کشی کرتی محسوس ہوتی ہے تاہم اِن

خاور اعجاز

سارے مثبت اور منفی رویوں کی پیش کاری میں شاعر کی ہنرمندی اور طرزِ اظہار کی طرفگی صاف جھلکتی ہے۔ ۱۹۹۱ء میں اُس کی شاعری کا ایک اور پہلو ''روشن دان میں چڑیا'' کے وسیلے سے قارئین تک پہنچا۔ یہ اُس کی ہائیکو شاعری کا مجموعہ ہے جس میں پاکستان کے خطۂ پوٹھوہار (اُس کی جنم بھومی) سے سعودی عرب کی سرزمین (جہاں وہ ایک عرصہ قیام پذیر رہا) تک کے اُن احساسات، جذبات، مناظر اور بود و باش کو قلمبند کیا گیا ہے جن کا اظہار نظم یا غزل کے پیرائے میں زیادہ موزوں طور پر نہ ہو سکتا تھا۔ اس مجموعہ نے ہائیکو کی کفایتی لَو سے بڑے کینوس پر پھیلے زندگی کے رنگا رنگ میورل کو ایسا ضیاپاش کیا کہ اُس کی ایک ایک لکیر اور ایک ایک خط جگمگا اُٹھا اور میورل میں سمائے ہُوئے مظاہرِ فطرت کے ساتھ تہذیبی خدوخال بھی نمایاں نظر آنے لگے۔ مجموعہ کے متنوع موضوعات زندگی کی گوناگوں کیفیات کے مظہر اور ہیئت کے اعتبار سے تین مصرعوں میں جہانِ حیرت سمو دینے کی مثال ہیں۔ ''جگنو دیے ستارے'' اُس کا تیسرا غزلیہ مجموعہ ہے جو ۱۹۹۳ء میں چھپا۔ اُس کا اگلا پڑاؤ ''اک لطیف سرگوشی'' ہے جو اُس کا دُوسرا ہائیکو مجموعہ ہے اور ۱۹۹۷ء میں قارئین تک پہنچا۔ اِس صنف میں تخلیقی رچاؤ کی یہ دُوسری پیشکش اپنی بے ساختگی کے سبب ہائیکو نواز طبقہ میں بہت مقبول رہی۔ ہائیکو کے اجزائے ترکیبی میں تصرف کے ساتھ نسیمِ سحر نے ہائیکو کے مضامین میں نہ صرف جاپانی ہائیکو کے بنیادی عناصر سے استفادہ کیا بل کہ برِصغیر کی شعری روایت کو بھی اس میں سمویا اور یوں دیگر ہائیکو نگاروں کے لیے بہت سے امکانی راستوں کی خبر بہم پہنچائی۔ ۱۹۹۸ء کا سال ''اتنے اچھے موسم میں'' لے کر آیا۔ اس مجموعہ کی غزلیات کا آغاز ''پرانے لفظ کیا مرقوم رکھنا / کتابوں میں نئے مفہوم رکھنا'' جیسے شعر سے ہوتا ہے جو اِس بات کا پیش خیمہ ثابت ہُوا کہ نسیمِ سحر اَب جو ہے اُسے معدوم اور جو نہیں ہے اُسے تخلیق کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ کتاب کے بیشتر مندرجات اُس کی اِس خواہش کے ترجمانی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ۲۰۰۲ء میں ''پس انداز'' کے نام سے اُس کے معدنِ غزلیات کا ایک اور نمونہ زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر آیا۔ یہ ایک ضخیم کتاب ہے جس کے عنوان سے گمان گذرتا ہے کہ اس میں گذشتہ اشاعتوں سے بچ رہنے والا مواد شامل ہو گا لیکن اِس ذخیرہ میں چھپی چنگاریاں تازہ تاپی گئی آگ کی نشاندہی

کرتی ہیں۔ ۲۰۰۳ء میں شائع شدہ ''چہرۂ خواب'' میں شامل ۸۴ غزلیں ایک ہی سال میں ہر ماہ سات غزلوں کے حساب سے اُس کی تخلیقی رفتار کی باضابطہ خبر ہے۔

محض دو سال کے وقفہ سے اُس کا بارھواں شعری مجموعہ ''خواب سب سے الگ'' ۲۰۰۵ء میں شائع ہُوا۔ اِس مجموعۂ غزلیات کو اُس کی شاعری میں روز افزوں دارفتگی کا ایک اور پڑاؤ کہا جا سکتا ہے۔ وہی اپنائیت جو اُس کی گذشتہ شاعری کا خاصہ رہی یہاں ایک تازہ مہک کے ساتھ موجود ہے۔ نسیم سحر کی ذات میں پائے جانے والے اخلاص اور وضعداری کے عناصر اس کتاب کے شعری سانچے میں ڈھل کر قاری کی مہمان نوازی کا فریضہ انجام دیتے نظر آتے ہیں۔ یہ مجموعہ اُس کے علمی، ادبی اور ثقافتی مشاغل کا آئینہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ اُس کی پُرگوئی کی بھی تصدیق کرتا ہے۔ اِس قدر پُرگو ہونے کے باوجود اُس کی شاعری میں کہنگی یا فرسودگی کے آثار نہیں پائے جاتے بل کہ پختہ سے پختہ تر ہوتی طباعی اور مشاقی اُس کا خیر مقدم اور اُس کے تجربوں کا عمق اُس کے شعری مطالب کو گہرائی سے آشنا کرتے نظر آتے ہیں۔ ۲۰۰۴ء میں کچھ وقت کے لیے اُس کے سنجیدہ کلام کی ''لائن کٹ گئی'' اور وہ اپنے مزاحیہ کلام کو مرتب کر کے نذر قارئین کرنے کے جتن میں مصروف رہا۔ ۲۰۰۷ء میں ''ترا ملنا ضروری ہے'' کے تحت اُس کے تب تک کے شائع شدا کلام کا انتخاب چھپا۔ اگرچہ انتخاب کا مرحلہ اُس وقت آنا چاہیے جب شاعر مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر دے یا پھر قدرت یہ فریضہ انجام دے دے تاہم ساٹھ کے پیٹے میں پہنچ کر انسان مختلف وسوسوں کا شکار اور وقت کی کمی کو شدت سے محسوس کرنے لگتا ہے۔ ایسے لمحات میں اپنی تخلیقی مہمات کا خلاصہ/انتخاب عام قارئین کے لیے نہایت مناسب رہتا ہے کہ انھیں ایک ہی جلد میں کئی جلدوں کا لطف مہیا ہو جاتا ہے۔

۲۰۱۴ء میں اُس کی حمدیہ نعتیہ شاعری کا دُوسرا مجموعہ منظرِ عام پر آیا - اس سے پیشتر ۱۹۹۶ء میں اس موضوع پر اس کا پہلا مجموعہ ''یہ جو سلسلے ہیں کلام کے'' شائع ہو چکا تھا۔ یہ دونوں کتابیں اُس کی مشقِ سخن سے زیادہ ذوق و شوق کے پیمانوں سے پرکھے جانے کے مستحق ہیں۔ اِن کے مطالعہ سے یہ گمان یقین میں بدلتا ہُوا محسوس ہوتا ہے کہ جس خوبی سے نسیم سحر نے نعت کا پُل صراط عبور کیا ہے، ان شاءاللہ اس کے صدقے میں اُسے حقیقی پُل صراط عبور کرنے میں بھی

وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ ۲۰۱۵ء میں مختلف اصناف سخن پر مشتمل مجموعۂ کلام ''مجھے ٹوٹنے نہ دینا'' نظروں سے گذرا تو نسیم سحر کی خوش نوائی مزید نکھری ہُوئی لگی۔ اگرچہ اُس کے اَب تک کے مجموعہ ہائے کلام کسی ایک ہی صنف پر مشتمل رہے لیکن موجودہ کتاب میں حمد، نعت، سلام، غزل، نظم، قطعہ، ہائیکو، ماہیا اور فردیات کا ایک ساتھ ہونا اگرچہ موضوعات میں تنوع کا احساس دلاتے ہیں لیکن پریشاں خیالی کا گمان بھی گذرتا ہے۔ ۲۰۱۶-۱۷ء کے دو برس اُس کی نثری مہمات میں صرف ہُوئے جس میں پہلے سال اُس کے تحریر کردہ خاکوں کا مجموعہ ''خاکہ گردی'' اور دوسرے سال تنقیدی مضامین اور دیباچوں پر مشتمل کتاب ''رشحاتِ نسیم سحر'' دیکھنے کا موقع ملا۔ ۲۰۱۹ء میں اُس نے اپنی کلیات مرتب کر کے شائع کی اور ادب کے طالبِ علموں کے لیے خود کو یکجا کر دیا۔ ۲۰۲۰ء میں محامد، نعوتِ رسولِ پاکؐ اور مناقب و سلام پر مبنی کتاب ''محورِ دو جہاں'' آئی جو اس کی اللہ تعالیٰ، اُس کے حبیبؐ اور دیگر عظیم ترین دینی ہستیوں کے حضور نذرانۂ عقیدت سے لبریز کلام ہے۔

اُس کی تازہ ترین کتاب ''جادو بھری شام'' کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ پُرسکون بہاؤ اُس کی شاعری کی ایک بڑی خوبی ہے۔ اُس کے اشعار کے مطالب اِس دَور کے بعض جدت نگاروں کی طرح کبھی بحور و اوزان کی حدوں کو پھلانگتے ہُوئے محسوس نہیں ہُوئے، وہ مضامینِ تازہ کی تلاش اور اُن کو معقول طریقے سے نظم کرنے کی تگ و دو میں رہتا ہے۔ گو اِس عمل میں کہیں کہیں وہ محض مضمون شکار کرنے کی غرض سے تیر چلاتا ہُوا بھی محسوس ہوتا ہے تاہم یہ رویہ شکار ہو چکے ہُوئے مضمون پر طبع آزمائی سے کہیں بہتر ہے لیکن اِس شوقِ تیراندازی میں اُسے چہار غزلہ جیسے پے در پے شکار کرنے سے قدرے پرہیز کرنا چاہیے کہ اکثر اوقات مہمان قاری پر اس قدر میزبانی کا بوجھ گراں گذرتا ہے۔ اُس کی غزلیہ شاعری تصوف، ہجر و وصال اور حالاتِ حاضرہ کی آمیزش سے صورت پذیری کے مراحل طے کرتی چلی جا رہی ہے۔ اپنے خیال کو الفاظ کا جامہ مہیا کرنے میں اُسے اِتنی مہارت اور سلیقہ حاصل ہو چکا ہے کہ یہ جامہ تراشنے میں اَب اُسے کوئی خاص مشکل پیش نہیں آتی تاہم اِس پیراہن پر نئے نئے ڈیزائن کی کشیدہ کاری کرنے میں اُس کی محنت کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔

☆☆☆☆☆

فرخندہ شمیم کے افسانوں کی صوفیانہ نہج

محترمہ فرخندہ شمیم ایک سینیئر افسانہ نگار، دانشور اور شاعرہ ہیں۔ وہ پی ٹی وی میں پروڈیوسر کے عہدے سے آغاز کرتی ہوئی کنٹرولر آف نیوز کے عہدے تک اہم نشریاتی، ادبی اور ابلاغِ عامہ کے فرائض سر انجام دیتی رہیں۔ ایک شاعرہ اور افسانہ نگار کے طور پر بھی ایک عرصے سے راولپنڈی کی ادبی و سماجی فضا میں سرگرم ہیں، کوئی ادبی محفل ان کی شمولیت کے بغیر نامکمل سمجھی جاتی ہے۔

ان کے افسانے، نظمیں، ہائیکو اور کبھی کبھار غزلیں بھی اردو جرائد میں شائع ہوتی رہتی ہیں جو مسلسل میرے مطالعے میں آتی رہتی ہیں۔ کئی کتابوں کی مصنفہ بھی ہیں، ان کے افسانوں اور شاعری کے زیادہ تر مجموعے بھی میری نظر سے گزر چکے ہیں۔ معریٰ اور آزاد نظموں کا مجموعہ ''ماں'' اور افسانوں کے دو مجموعے ''مٹی اور پاؤں'' اور ''تلاشِ جمال میں گمشدہ عورت'' کے معنی خیز عنوانات سے شائع ہو چکے ہیں جبکہ تازہ ترین افسانوں کا مجموعہ ''آسمان کا تیسرا کونہ'' ابھی ابھی نیشنل بک فاؤنڈیشن جیسے معیاری اشاعتی ادارے سے شائع ہوا ہے۔

ان کے افسانوں کی صوفیانہ نہج پر لکھنے سے پہلے یہ کہتا چلوں کہ یہ صوفیانہ نہج اولاً کسی بھی قلمکار کی شخصیت میں ہوتی ہے جو کہ نہ صرف اس کی ذاتی گفتگو، کردار اور اپنے رہتل میں مختلف انداز سے ظاہر ہوتی رہتی ہے بلکہ کسی بھی نثری یا منظوم صنفِ سخن کے تخلیقی عمل میں اس کا یہ وصف شعوری یا لاشعوری طور پر ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ فرخندہ

نسیمِ سحر

شمیم کی یہ اہم جہت ان کے اعلیٰ سرکاری منصب پر متمکن رہتے ہوئے بھی ان کی گفتگو اور دوسروں سے روابط کے دوران نمایاں تھی۔ دنیوی ماحول میں زندگی کے تقاضوں کے باوجود ان کا اللہ کے ساتھ تعلق بڑا مضبوط ہے، روحانیت کی خوشبو دار کیفیات ان کی ذات سے جھلک اور چھلک رہی ہیں جس کے نتیجے میں وہ ظاہری نمود و نمائش اور دنیاوی دکھاووں سے ماورائی شخصیت محسوس ہوتی ہیں۔ ان میں دنیا سے بے رغبتی، سادگی اور باطن کی پاکیزگی کے اوصاف بدرجۂ اتم ہیں۔ ان کے سبب ہی وہ اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جانتی ہیں، مذہبی تعلیمات پر مسلکی تنگ نظری سے بالا ہو کر عمل کرتی ہیں اور خیر اور نیکی کی جانب مائل رہتی ہیں۔ ان میں روح کی پاکیزگی بھی ہے اور تبلیغی انداز میں ناصحانہ بات کرنے کے بجائے وہ اپنے کردار اور اپنے قلم سے اس مثبت وصف کی جانب مائل کرتی ہیں۔ ان کی شاعری ہو یا نثر، عشقِ مجازی کی جگہ عشقِ حقیقی کی جانب ان کے روحانی اور صوفیانہ سفر کا احساس ہوتا ہے۔

فرخندہ شمیم کی غزلوں، نظموں اور ہائیکوز میں بھی مجھے ان کی اس صوفیانہ نہج کا اشارہ ملا، کہیں ڈھکا چھپا، کہیں بہت واضح، لیکن چونکہ میرے اس اظہاریے کی اساس ان کے تازہ افسانوں کے مجموعے ''آسمان کا تیسرا کونہ'' کی صوفیانہ نہج تک ہی محدود ہے اس لیے میں ان کی جملہ نثری و منظوم تحاریر میں اس کا مجموعی احاطہ نہیں کر رہا۔ اسی لیے کتاب میں شامل ان کے بہت سے افسانوں میں سے بھی کچھ چنیدہ افسانوں میں ہی اس صوفیانہ نہج کی نشان دہی تک خود کو محدود کر رہا ہوں، ورنہ یہ اظہاریہ ایک مقالے میں بھی تبدیل ہو سکتا تھا۔ اس صوفیانہ نہج کی واضح نشان دہی کتاب کے عنوان ''آسمان کا تیسرا کونہ'' سے ہی ہو رہی ہے جو ان کی صوفیانہ نہج کی ترجمانی کر رہا ہے۔ اسی طرح، ان کے افسانوں میں ایک مجموعی فضا اس صوفیانہ انداز کی غمازی کرتی ہے، کہیں افسانے کے بیانیے میں، اور کہیں اس کے کرداروں کے مکالموں میں۔ مثال کے طور پر ان کے ایک افسانے کا عنوان ''اذان'' ہے جو بذاتِ خود اسی کیفیت کی نشان دہی کرتا ہے۔ وہ اس کردار کی ذہنی و قلبی کیفیات بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں:

''دادا ابو نے کلمہ شریف کے بعد اسے پکڑ پکڑ کر جس چیز کی اہمیت اور معنویت سکھانا چاہی تھی وہ اذان اور نماز کی تھی جس کی پکار آسمان والے کے حکم سے آتی سو اس سب سے بڑے وجود کی اطاعت کا تقاضا کرتی ہے، اور یہ کہ اسے سننا طوافِ کعبہ سے بھی زیادہ پر فوقیت ہے۔''

اسی افسانے میں ایک بچے کے کردار کے

ذریعے مصنفہ نے پوری امتِ مسلمہ کے لیے ایک اہم سوال اٹھایا ہے:

''دادا جی، سگر نماز ایک ہی اللہ کے لیے ہے، ایک سے الفاظ رکھتی ہے، ایک ہی مقصد عبادت کے لیے ہے تو پھر الگ الگ نام کیوں؟''

جس کے جواب میں دادا کہتے ہیں: ''کیا بتاؤں بیٹا، یہ الگ الگ مسلکوں کی علیحدہ علیحدہ کہانیاں ہیں، ہر گروہ خود کو درست اور سچا تابع شریعت سمجھتا ہے، دوسروں کو حقیر جانتا ہے، اس طرح مذہب جیسی چیز سے منفی کام لے کر سوسائٹی میں انتشار پھیلاتا رہتا ہے۔''

''کتاب'' نامی افسانے کا فوکس تو کرونا وائرس ہے مگر اس میں بھی ایسے صوفیانہ بیانیے ملتے ہیں:

''غارِ حرا سے انسان کو حدود میں رکھنے کی تاکید کی جاتی رہی ہے، حیا کی، حجاب کی، منہ سے تھوک اور بدبو نہ پھینکنے کی، لباس پورا پہننے کی، آنکھیں چھپا کر رکھنے کی ---''

اس کے ایک کردار کی زبانی یہ مکالمہ ملاحظہ ہو:

''دنیا کو کوئی ختم نہیں کر سکتا ماسوا کہ جس نے اسے بنایا، پوری راجدھانی اکیلے اسی کی ہے جو اس کا مالک ہے، ان دیکھے اور اَن بنائے معبود پر ایمان میں جو مزا ہے، وہ پتھر کے صنم میں نہیں، خود اپنے ہاتھ سے پتھر کا جسم اور نشانیاں تراشنا اور تراش کر ان کی تابعداریاں کرنا بھی کوئی عبادت ہے؟''

افسانے ''جرثومہ'' سے ایک بیانیہ:

''جرثومے خدا کی مرضی کے بغیر نمو نہیں پا سکتے۔ میں اس ذات کی قوت کی بے پناہ معترف ہوں-- اور انسان کی بے بسی کا بھی زبردست اعتراف کرتی ہوں''

اسی افسانے کے ایک کردار کے مکالمے سے ایک ٹکڑا: ''تکبّر زلزلہ ہے، سکون کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے''۔

''دیوارِ گریہ'' سے ایک صوفیانہ دانش پارہ ملاحظہ ہو:

''الہامیت دنیا دار نہیں ہوتی بلکہ روح کو پوتر کرتی ہے''۔

فرخندہ شمیم کی اس روحانیت اور صوفیانہ سَن کو ادبی کائنات کی طرف سے سلام اور کلماتِ داد و تحسین، کہ وہ اپنے افسانوں اور شاعری میں اسلام کی اہم تعلیمات کے ساتھ ساتھ خدا کی وحدانیت کے ایمانی اور اعتقادی اعتراف کے ساتھ ساتھ بت پرستی اور مذہبی تنگ نظری کے خلاف بھی ایک سچے مسلمان کے طور پر قلمی جہاد کر رہی ہیں، یہ بھی کہنا ضروری ہے کہ عہدِ موجود میں لکھے جانے والے افسانوں اور شاعری میں یہ صوفیانہ رجحان اپنی اہمیت کے باوجود کم کم ہی نظر آتا ہے اس لیے فرخندہ شمیم کی اس صوفیانہ نہج کو قومی اور ادبی سطح پر بھرپور پذیرائی ملنی چاہیے۔ وما علینا الا البلاغ

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر طاہر شبیر.....ایک حقیقی عوامی، انقلابی شاعر

فرحت عباس شاہ

اس میں کوئی شک نہیں کہ شعر سمفنی میں ڈھل کے نکلنے والی دل کی اس آواز کا نام ہے جو دوسرے دلوں پر اثر کرنے کی طاقت رکھتی ہے۔

رجز، جنگی ترانوں، بہادروں کی داستانوں اور شاہوں کے قصیدوں کا سفر طے کرتی، حسن و عشق کے نغمے اور آہ و فغاں کے نوحے بنتی آج اس منزل پر پہنچ آئی ہے جہاں درج بالا تمام کے تمام مدارج اپنی طاقت اور مرتبہ کھو بیٹھے ہیں۔ آج شاعری جب تک کائناتی، سماجی سیاسی اور معاش شعور سے لیس نہ ہوئی بڑی شاعری کہلانے کی مستحق نہیں ٹھہرتی۔ سستی جذباتیت اور جنسی تلذذ کی شاعری تو جیسے خود ایسے شعر کہنے والے شعرا کو جبلتوں کے مارے لوگ ڈکلیر کر کے ادبی تاریخ کے چوک میں ننگا کر دیتی ہے۔

آج جو شاعر اپنے اردگرد کے حالات سے بہرہ ور نہیں وہ حقیقی معنوں میں باشعور اور باضمیر شاعر کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔

جس عہد میں اسلحہ ساز فیکٹریاں اپنا مال بیچنے کے لیے شہر کے شہر بموں کی نذر کر دیں، جنگوں کی زد میں لائے گئے شیر خوار بچوں تک خوراک نہ پہنچنے دی

جائے، حکمران طبقہ عام انسانوں کو کیڑے مکوڑے سمجھ کر بھوک اور طاقت کے جبڑوں تلے دبا کر کچلنے پہ تُلا ہوا ہو وہاں جنسی فرسٹریشن کو منظوم کر کے اس کے شعر ہونے کا دعویٰ کرنا ظلم، بددیانتی اور جہالت نہیں تو اور کیا ہے۔ وہ تو شکر ہے کہ آج کے اس عہدِ ناپرساں میں بھی عابد حسین عابد اور ڈاکٹر طاہر شبیر جیسی نظریاتی اور عوام دوست، انسانی آوازیں موجود ہیں جو اپنے شعروں کی سچائی سے سرمایہ دارانہ نظام کے مکروہ چہرے سے نقابیں اور حکمران طبقے کی درندگی پر پڑے پردوں کو تار تار کرنے کا عمل جاری رکھے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر طاہر شبیر حبیب جالب کے بعد دوسرا اور عہد حاضر کا واحد شاعر ہے جسے عام آدم کے لب و لہجے میں شعر کہنا آتا ہے۔ اس کی نثر ہو یا نظم ایسی نظریاتی ہم آہنگی کی مثال پیش کرتی ہے کہ میرے جیسے انسان کو رشک آتا ہے۔

ڈاکٹر طاہر شبیر ایک ایسا شفاف، سادہ اور سچا شاعر ہے جس کی ذات، نظریے، کردار اور کلام میں تضاد تلاش کرنا ممکن نہیں۔

درج ذیل میں دیئے گئے منتخب کلام کی ادراکی تفہیم اور تجزیہ مارکسی نقطہء نظر سے پیش خدمت ہے۔

معلوم ہے اس فکر میں خطرات بڑے ہیں
ہم بائیں طرف ڈٹ کے نظریے پہ کھڑے ہیں

اک آبلہ پا میں ہی اکیلا تو نہیں ہوں
چھالے سبھی احباب کے پیروں میں پڑے ہیں

ذلت ہی مقدر ہے یہاں پیش وروں کا
ہر دور کے حاکم کے جو قدموں میں پڑے ہیں

اب تک جو مرے ساتھ ہیں سب اہل نظر لوگ
لگتا ہے انگوٹھی میں نگینے سے جڑے ہیں

ہم جانتے ہیں کفر کے فتووں کی حقیقت
ہر دین کے مُلّا نے یہ افسانے گھڑے ہیں

میں حق کی کسی جنگ میں تنہا تو نہیں تھا
ہر بار مرے یار مرے ساتھ لڑے ہیں

.....

نظم ''اس کھیل میں اپنی مات نہیں''

ہم اہل جنوں کے شانوں پر اس سر کی اب اوقات نہیں
جب سُرخ پھریرے تھام لیے پھر خوف کی کوئی بات نہیں
اب جان ہتھیلی پر رکھ کر سرمایہ دار سے لڑنا ہے
ہم جان گئے ہم جیتیں گے اس کھیل میں اپنی مات نہیں
گر محنت کرنے والوں کو جینا ہے مشکل آج یہاں
سر کرائیں دیواروں سے اب ایسے بھی حالات نہیں
شاہوں کی شان میں لکھنا ہی اس دیس میں اب دستور ہوا
وہ حرف حق جو لکھتے ہیں قسمت میں اُن کی رات نہیں
سب رہبر اپنے رہزن ہیں گھر گھر میں راج ہے غربت کا
افلاس کے مارے لوگوں کے اب پہلے سے جذبات نہیں
جو رستہ بھول گئے اُن کو منزل کی راہ دکھانی ہے
گو کام بہت یہ مشکل ہے کم اس میں کچھ آفات نہیں

اس دیس میں رہنے والوں کا یہ حال ہو ہے لڑ لڑ کر
ہم جس کی خواہش رکھتے ہیں وہ امن کی اب سوغات نہیں
اک عمر ہوئی ہے طاہر نے شاہوں کے قصے چھوڑ دیئے
سچ کہتا ہے، سچ لکھتا ہے، اب اُس کی وہ عادات نہیں

.....

نظم ''محافظ''

باغبانوں نے میرے گلشن میں
پھول روندے ہیں اپنے پیروں سے
گھر کو لوٹا ہے ہر محافظ نے
کیسے شکوہ کروں میں غیروں سے

نظم ''بیٹی غریب کی''

سچے ہیں رہبروں کو جو دیتے ہیں گالیاں
غربت کے دُکھ سے اُن کی ہیں آنکھوں میں لالیاں
بیٹھی ہے سج کے سیج پہ بیٹی غریب کی
پہنی ہیں جس نے آج بھی پیتل کی بالیں

.....

متذکرہ بالا کلام کا ادرا کی تنقیدی تھیوری (Perceptionism) کے زاویے سے جائزہ پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

ڈاکٹر طاہر شبیر کا کلام ایک شفاف، سادہ اور نظریاتی ہم آہنگ کا شاعر کی علامت ہے جو عوامی درد، سماجی ناانصافی اور سرمایہ دارانہ نظام کی مکروہ حقیقتوں کو بے نقاب کرتا ہے۔ ان کی نظم اور اشعار میں ایک واضح انقلابی موقف نظر آتا ہے، جہاں شاعر نہ صرف طبقاتی شعور کے حامل افراد کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے بل کہ عوامی بیداری اور اجتماعی جدو جہد کی طاقت کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ شاعر کی یہ بصیرت کہ وہ ''بائیں بازو کے نظریے پر ڈٹے ہیں'' اور یہ کہ جدو جہد میں وہ اکیلے نہیں بل کہ تمام اہل نظریہ کامریڈز کے شانہ بشانہ کھڑے ہیں۔

یہ جدو جہد ظاہر کرتی ہے کہ محدود، وسائل اور مرعوب انسانی ادراک کے باوجود اجتماعی شعور اور تجربہ کسی بھی اکیلے موقف کی طاقت کو بڑھا سکتا ہے، جو Preceptionism کے نقطۂ نظر سے ایک اہم ادرا کی حقیقت ہے۔ ان کا کلام مذہب کے سیاسی استعمال اور حکمران طبقے کے استحصال کو بے نقاب کرتا ہے اور اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ مذہب اور اقتدار اکثر عوام پر قابو پانے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں، اور حقیقی انقلابی شعور ارو نظریے کی بنیاد پر ہی ممکن ہے۔ ڈاکٹر طاہر شبیر کی شاعری میں محنت طبقے کی مشکلات، غربت، افلاس اور سرمایہ دارانہ استحصال کے خلاف آواز بلند کی گئی ہے، اور یہ دکھایا گیا ہے کہ اگر عوام شعور، جرأت اور مشترکہ عزم کے ساتھ آگے بڑھیں تو سرمایہ دارانہ طاقت کے خوف کو بے اثر کیا جاسکتا ہے۔

ان کا کلام اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ جدو جہد میں حتمی فتح کا تعلق صرف الفاظ یا جذبوں سے نہیں بل کہ عملی اور نظریاتی موقف سے ہے اور سچائی اور انصاف پر قائم رہنے والے افراد کی حمایت اور اجتماعی

جدوجہد کے بغیر معاشرتی تبدیلی ناممکن ہے۔ ڈاکٹر طاہر شبیر کی شاعری میں شاہوں، محافظوں اور حکمران طبقے کے مکروہ کردار کو بے نقاب کرنے کے ساتھ ساتھ عوامی زندگی کے چھوٹے مگر حقیقی تجربات، جیسے غریب کی بیٹی کی محرومی، غربت میں رہنے والے عومک کی حالت، اور سرمایہ دارانہ نظام کے مظالم کی تفصیل شامل ہے، جو نہ صرف مارکسی نقطۂ نظر سے طبقاتی استحصال کی نشاندہی کرتی ہے بل کہ Preceptionism کے زاویے سے بھی محدود انسانی ادراک کی بنیاد پر حقیقت سماجی شعور پیدا کرنے کا عملی مظاہرہ ہے۔ ان کے کلام میں نظریہ، ذات اور کردار کی ایک ایسی وحدت موجود ہے جو تضاد سے پاک ہے، اور یہی خصوصیت انھیں ایک حقیقی عوامی، نظریاتی اور انقلابی شاعر کے طور پر ممتاز کرتی ہے، کیونکہ وہ شاعری کو محض ادبی اظہار کے بجائے ایک انقلابی، مزاحمتی اور شعوری ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر، ڈاکٹر طاہر شبیر کا کلام سرمایہ دارانہ استحصال، طبقاتی ناانصافی، حکمران طبقے کی زیادتی اور عوامی محرومیوں کے خلاف ایک جامع ادبی احتجاج ہے، جو نہ صرف عوامی شعور بیدار کرتا ہے بل کہ انھیں سماجی اور سیاسی تبدیلی کے لیے متحرک بھی کرتا ہے اور اس اعتبار سے ان کا کلام ترقی پسند، مذمتی اور انقلابی ادب کی بہترین روایت کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔

آخر میں یہ ضرور بار دگر واضح کرتا ہوں گا کہ ڈاکٹر طاہر شبیر کی شاعری نہ صرف ادبی حسن اور جذباتی اظہار کی مثال ہے بل کہ عوامی شعور، نظریاتی ہم آہنگی اور سماجی انصاف کی روشن دستاویز بھی ہے۔ ان کے کلام میں طبقاتی جدوجہد اور عوامی تجربات کی بصیرت نمایاں ہے، جو Preceptionism کے اصولوں کے عین مطابق ہے۔ مارکسی تنقید کے نقطۂ نظر سے ان کا کلام سرمایہ دارانہ نظام، حکمران طبقے کی زیادتیوں، مذہبی اور سیاسی استحصال، غربت اور محرومی کے خلاف ایک مضبوط، مزاحمتی موقف اختیار کرتا ہے اور عوام کو شعور، ہمت اور امید دیتا ہے۔ ڈاکٹر طاہر شبیر کی شاعری اس عہد کے سچے اور نظریاتی شاعری کی نمائندگی کرتی ہے، جو صرف الفاظ کے کھیل یا جمالیاتی تفریح کے لیے نہیں بل کہ استحصالی سامراجی نظام کے خلاف مزاحمت اور انسانی بیداری کے لیے وجود میں آئی ہے۔ یہی خصوصیات ان کے کلام کو ایک مستقل، پختہ اور تاریخی اہمیت بخشتی ہیں اور یہ ثابت کرتی ہیں کہ حقیقی شعری طاقت عوام کی زندگی، شعور اور اجتماعی جدوجہد کے ساتھ جڑی ہوئی ہے، اور ڈاکٹر طاہر شبیر کے کلام میں یہی طاقت عیاں ہے۔

☆☆☆☆☆

شعر کا اعتبار، ساجد ہے

یہ اسّی کے عشرہ کی بات ہوگی۔ کالج سے موسمِ بہار کی چھٹیاں تھیں۔ اُس روز عزیز دوست خالد علیم صاحب سے بھی ملاقات طے نہ ہو پائی تھی۔ چناں چہ میں اکیلا ہی چل پڑا لاہور کے معروف علاقہ رائل پارک میں واقع ادبی رسالہ ''محفل'' کے دفتر کی طرف۔ اُس دور میں پیدل سفر میں بہت لطف آتا تھا۔ مولا بخش روڈ سے مزنگ اڈہ پہنچا اور وہاں سے صفانوالہ چوک اور ٹمپل روڈ سے گزرتا ہوا چوک ریگل پر مال روڈ کو عبور کر کے بیڈن روڈ پر ہولیا اور پھر دائیں مُڑ کر چند قدم کو پر روڈ پر چلا اور بائیں جانب سے آغاز ہوتے رائل پارک میں داخل ہوگیا۔ اصل پارک بھی شاید کسی زمانے ہو وہاں مگر مجھے تو وہاں ہمیشہ سے (اُس دور کے مطابق) اونچی اونچی عمارتیں ہی دکھائی دے رہی تھیں جن کے نچلے حصوں میں دکانیں تھیں اور اُوپر ہر منزل پر فلم سازوں اور فلم تقسیم کاروں کے دفاتر تھے۔ دائیں بائیں زیرِ تکمیل فلموں کے بورڈ آویزاں تھے۔ مجھے رائل پارک کی چار نمبر بلڈنگ تک پہنچنے میں بس چند منٹ ہی لگے۔ غالباً اسی عمارت میں ممتاز آرٹسٹ بشیر موجد صاحب کا پرنٹنگ پریس بھی ہوا کرتا تھا۔ اس عمارت میں بھی سبھی دفاتر فلم ساز اداروں کے تھے۔ زینے عبور کیے تو دائیں جانب عنایت حسین بھٹی کی بھٹی پکچرز کا دفتر دکھائی دیا۔ دروازہ کُھلا تھا۔ اندر فلم 'راجو راکٹ' اور 'منزل' کے پوسٹر آویزاں تھے اور قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ مگر میں بائیں جانب ہلکے سبز رنگ کے دروازے میں داخل ہوگیا۔ یہی

حامد یزدانی

ماہ نامہ ''محفل'' کا دفتر تھا۔ اس عمارت میں کہ اس علاقہ کا اکلوتا غیر فلمی دفتر۔۔۔ جس میں ایک میز کے پیچھے رسالہ کے مدیر یزدانی جالندھری تشریف فرما تھے جب کہ دوسرے قدرے بڑے میز سے لگی کرسی پر مدیر اعلیٰ طفیل ہوشیار پوری تقریباً نیم دراز تھے۔ ہم طفیل صاحب کو 'تایا جی' کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ ہاں، جب کبھی وہ ہمارے گھر آتے امی جان سے مسلسل نوک جھونک چلتی کہ وہ ان کے ''جیٹھ'' ہیں یا ''دیور''۔ امی جان مصر رہتیں کہ وہ 'جیٹھ' ہیں جب کہ تایا طفیل ہنستے ہوئے 'دیور' ہونے کی تکرار کرتے رہتے۔ ان کی یہ نوک جھونک زندگی بھر ختم نہ ہوئی۔ طفیل صاحب والد گرامی کے چالیس سال پرانے دوست تھے اور دونوں میں گویا بھائیوں جیسی محبت تھی۔ تایا جی کا خاندان بھی ہمیں اپنے گھر کے افراد ہی خیال کرتا تھا۔

خیر، اُس وقت ''محفل'' کے دفتر میں دیسی ساگ پکنے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ تایا جی نے کمرے کی کھڑکی میں رکھے ایک چولہے پر مٹی کی ہنڈیا میں ساگ ''چڑھا'' رکھا تھا۔ میں نے دونوں بزرگوں کی خدمت میں ایک ہی سلام پیش کیا۔ جس کے جواب نے والد صاحب نے تو آہستگی سے وعلیکم السلام کے الفاظ کہے جب کہ تایا جی ہڑبڑا کر بیدار ہو گئے اور میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے جلدی سے ہنڈیا کی جانب متوجہ ہو گئے۔ انھیں ڈر تھا کہ کہیں ان کا ساگ 'لگ' نہ گیا ہو۔ انھوں نے ہنڈیا کا ڈھکن اتار کر لکڑی کی 'ڈوئی' سے کچھ ساگ نکالا اور اسے چکھتے ہوئے کہنے لگے:

''بیٹا جی۔ بالکل صحیح وقت پر آئے ہو۔ ہمارا ساگ بھی تیار ہی ہے۔ ابھی مقبول (سرمد) سے کہہ کر تنور سے گرم گرم روٹیاں منگواتے ہیں اور اس ساگ کا مزہ لیتے ہیں۔''

والد صاحب ان کی بات سُن کر مسکرائے ضرور مگر اپنی نظر کتابت شدہ مسودہ سے ہٹائی نہیں۔ وہ آئندہ شمارہ کی پروف ریڈنگ میں مصروف تھے۔

اتنے میں سلام کرتے ہوئے ایک اور صاحب کمرے میں داخل ہوئے؛ خوش شکل، خوش لباس، لہجہ سے جھلکتی تہذیب۔۔۔ انھوں نے پہلے دونوں بزرگوں سے مصافحہ کیا اور پھر اپنا ہاتھ میری طرف بڑھاتے ہوئے تعارفاً بولے:

''مجھے اعتبار ساجد کہتے ہیں۔''

میں نے اپنی کرسی سے اٹھ کر ان سے ہاتھ ملایا اور جواباً کہا:

''حامد یزدانی۔''

''اوہو، ماشاءاللہ۔ تو آپ یزدانی صاحب کے صاحب زادے ہیں۔ ماشاءاللہ۔''

انھوں نے پُرجوش انداز میں کہا تھا اور

میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔
میں اعتبار ساجد صاحب کے نام اور ان کی شاعری سے تو متعارف تھا مگر بالمشافہ ملاقات کا پہلے کبھی موقع نہ ملا تھا۔
اور پھر جب بھائی مقبول سرمد روٹیاں لے آئے تو سب نے تایا جی کے پکائے ساگ سے لطف اٹھایا۔ اس کے بعد کھڑکی سے نیچے چائے کے لیے آواز لگائی گئی۔ چند منٹ ہی میں چائے ہمارے سامنے تھی۔ چائے پی گئی۔
اعتبار ساجد طفیل صاحب اور یزدانی صاحب سے باتیں کرتے رہے۔ میں بس 'جی جی' کر کے گفت گو میں شریک رہا۔ انھوں نے شاعری، ادبی گروہ بندیوں، مضافات سے آئے شعرا کے ساتھ بڑے شہر کے لکھاریوں کے سلوک، ریڈیو، ٹی وی پر مخصوص طبقہ کی اجارہ داری، اخبارات کے ادبی ایڈیشنز کے متنازع مواد، ''بڑے مشاعروں'' میں شمولیت کے لیے اختیار کیے جانے والے ہتھکنڈوں اور جانے کس کس موضوع پر ہلکی پھلکی گفت گو کی۔ پھر اچانک اعتبار ساجد صاحب میری طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے:
''بھائی، شاعری تو آپ کرتے ہوں گے۔ یہ مجھے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بتایئے شاعری کے علاوہ کیا شغل ہے؟''
میں نے انھیں بتایا کہ میں گورنمنٹ کالج لاہور میں زیرِ تعلیم ہوں اور ان دنوں بہار کی چھٹیاں 'منا' رہا ہوں۔
میں خاموش ہوا تو وہ بولے:
''بھئی، واہ۔ ماشاء اللہ — بڑی خوشی ہوئی یہ جان کر۔ مگر مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ بہار کا ایسا خوب صورت دن اور وہ بھی چھٹی کا دن ایک نوجوان ادبی رسالے کے دفتر میں کیوں گزار رہا ہے؟''
مجھے فوری طور پر ان کی بات سمجھ نہ آئی۔ میرے چہرے پر پھیلے استفہام کو بھانپتے ہوئے، ہنس کر کہنے لگے:
''میرا کہنے کا مطلب یہ ہے بھائی کہ یہ موسم باہر سیر و تفریح کر کے گزارو۔ کچھ مزے کرو۔ اگر کوئی اور مصروفیت نہ ہو تو میرے ساتھ چلو۔ مل کر لاہور کی سیر کرتے ہیں۔''
پھر والد صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا:
''یزدانی صاحب، اجازت ہے؟ کیا میں ساتھ لے جا سکتا ہوں اسے؟''
والد صاحب نے فرمایا:
''مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ مگر اس کا فیصلہ حامد خود کرے گا۔''
یہ سُن کر اعتبار ساجد صاحب نے میری طرف دیکھا اور میں نے ان کے ساتھ ''لاہور گردی'' کے فیصلہ کا اعلان کر دیا۔
بزرگوں کو سلام کہہ کر ہم دونوں رائل پارک کی اس بلڈنگ کی سیڑھیاں اترے تو پاکستانی فلمی

صنعت اور بھارتی فلموں کے معیار پر بات کرنے لگے۔ لکشمی چوک سے دائیں مُڑے اور پہلے پاکستان ٹیلی ویژن اور پھر کچھ دیر کے لیے ریڈیو سٹیشن رُکے جہاں اعتبار ساجد صاحب کو احباب سے ملنا تھا۔ وہاں سے نکلے تو پیدل ہی واپس لکشمی چوک کی طرف ہو لیے۔ راستے بھر دائیں بائیں سنیما گھروں میں دکھائی جانے والی فلموں پر باتیں کرتے رہے۔ اعتبار ساجد صاحب نے ملتان میں گزرے شب و روز اور کوئٹہ میں اپنی مصروفیات کا بتاتے ہوئے وہاں کے ٹی وی پر نشر ہونے والے اپنے ڈراموں کی مقبولیت کے بارے میں بھی مجھے بتایا اور پھر لاہور سے اپنی محبت اور موقع ملتے ہی اس شہر کا رُخ کرنے کا سبب یہاں اپنے دوستوں کی کشش کو قرار دیا۔

ہم نے لکشمی چوک کے قریب ایک ریستوران سے چائے پی اور نسبت روڈ کی طرف چل نکلے۔ دیال سنگھ لائبریری کو پیچھے چھوڑتے ہوئے گوالمنڈی چوک کے پاس پہنچے تو وہ ایک عمارت کی تنگ سی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ مین ان کے پیچھے پیچھے تھا۔ سیڑھیاں چڑھ کر ہم رسالہ ''آداب عرض'' اور ''چاند'' کے چھوٹے سے دفتر میں پہنچے جہاں ان رسالوں کے مدیر خالد بن حامد نے ہمیں خوش آمدید کہا۔

اعتبار ساجد نے تعارف کرواتے ہوئے انھیں کہا:

''آپ دونوں کے نام میں 'حامد' موجود ہے۔ تو ایک لحاظ سے آپ دونوں ہم۔ نام ہی ہوئے۔''

اور ہنسنے لگے۔

خالد بن حامد اور اعتبار ساجد صاحب کی باہمی گفت و شنید سے مجھے ان کے قریبی تعلق کا اندازہ ہو رہا تھا۔ وہ خاصے بے تکلف تھے۔ جتنی دیر وہاں بیٹھے، قہقہے بلند ہوتے رہے۔ اس دوران میں خالد صاحب نے اعتبار ساجد صاحب کے حوالے کچھ خطوط بھی کیے جو اعتبار صاحب کے قارئین یا مداحین نے رسالہ کی وساطت سے انھیں بھیجے تھے۔ اعتبار صاحب انھیں پڑھ کر بہت مسرور و محظوظ ہوئے۔ پھر مجھے کہنے لگے:

''دیکھیں، خالص ادبی جرائد کی اہمیت اپنی جگہ مگر ''آداب عرض'' جیسے میگزین بھی اپنے طور پر ادب ہی کی خدمت کر رہے ہیں۔ ادبی جرائد کے مقابلے میں ان رسالوں کے قارئین کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ اسے پڑھنے والے ملک بھر سے مجھے خطوط لکھتے ہیں۔ یہ تو وہ ہیں جو رسالہ کے پتے پر آئے، زیادہ خطوط براہ راست مجھے موصول ہوتے ہیں۔ میں اس میں اپنی شاعری اور افسانے چھپوانا پسند کرتا ہوں۔ انھیں خاص کر نوجوان بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ میں تو کہوں گا کہ آپ بھی اس میں اپنی تخلیقات دیا کریں۔''

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور تازہ تخلیق انھیں بھیجنے کا وعدہ بھی کر لیا۔
ہم وہاں سے نکل کر انارکلی میں پاک ٹی ہاؤس کی جانب بڑھ رہے تھے تب اعتبار صاحب نے مجھے کچھ سنانے کو کہا تو میں نے ایک غزل کے چند اشعار انھیں سنا دیے:

گھر سے وہ نکلی ہے یوں پیلا دوپٹہ اوڑھ کر
چاند نکلے جس طرح چہرے پہ ہالہ اوڑھ کر

اِن دنوں دل کا جزیرہ اس طرح ویران ہے
خشک دریا سو رہا ہو جیسے صحرا اوڑھ کر

بنتِ حوّا بڑھ رہی ہے دورِ ماضی کی طرف
کل پھرے گی، دیکھ لینا، ایک پتا اوڑھ کر

.....

انھوں نے حوصلہ افزائی کی اور پھر اپنا کلام بھی مجھے سنایا جو متنوع کیفیات کا حامل شائستہ اور خوب صورت تھا۔

صف بستہ ہیں ہر موڑ پہ کچھ سنگ بکف لوگ
اے زخمِ ہُنر، لطفِ پزیرائی تو اب ہے

.....

پھول تھے رنگ تھے لمحوں کی صباحت ہم تھے
ایسے زندہ تھے کہ جینے کی علامت ہم تھے

.....

ڈائری میں سارے اچھے شعر چن کر لکھ لیے
ایک لڑکی نے مرا دیوان خالی کر دیا

کسے پانے کی خواہش ہے کہ ساجدؔ
میں رفتہ رفتہ خود کو کھو رہا ہوں

.....

اس تعارفی ملاقات کے بعد پھر جب بھی وہ لاہور تشریف لاتے، ملاقات کا شرف بخشتے۔ ہم ادبی تقاریب میں بھی اکٹھے ہو جاتے۔ میں اُن کی تصانیف سے مسلسل استفادہ کرتا رہا۔ بہت نظر سے یہ خوش خبری بھی گزری کہ ہمارے عزیز دوست، شاعر و ادیب صدام ساگر نے اکادمی ادبیاتِ پاکستان کے اشاعتی سلسلہ ''پاکستانی ادب کے معمار'' کے لیے اعتبار ساجد صاحب کے فن و شخصیت پر ایک جامع کتاب بھی مکمل کر لی ہے۔ مگر افسوس، اس کتاب کی اشاعت کی خوش خبری ان کی زندگی میں تو موصول نہیں ہوئی۔ شاید اب ہو جائے!

جب میرا پہلا شعری مجموعہ ''ابھی اک خواب رہتا ہے'' شائع ہوا اس وقت میں جرمنی میں مقیم تھا۔ بھائی ساجد یزدانی نے نوائے وقت کے دفتر میں اعتبار صاحب کو اعزازی نسخہ پیش کیا تو انھوں نے ایک زبردست تحسینی مضمون قلمبند کر کے اسی اخبار میں شائع کروایا۔ میں پاکستان گیا تو ان کا شکریہ ادا کیا جس پر انھوں نے خوشی ساتھ ساتھ شاعری کی بگڑتی ہوئی صورت پر تشویش کا اظہار کیا اور بالخصوص نوجوان

نسل کی تساہل پسندی اور ''سستی'' شہرت کے لیے تگ و دو پر دکھ کا اظہار کیا۔ انھوں نے یزدانی جالندھری صاحب جیسے وضع دار بزرگوں اور ان کے شعر میں خلوص اور برکت کا ذکر بھی بڑی محبت سے کیا۔

میں جب کینیڈا آ گیا تو پھر فیس بک کی وساطت سے ہم ایک دوسرے سے منسلک رہے۔ میں سوشل میڈیا پر ان کے شعری مجموعوں کی مقبولیت اور تعلیمی اداروں میں کیے جانے والے تحقیقی کام کے بارے میں پڑھتا تو انھیں مبارک باد کا پیغام بھیجتا۔ جواباً وہ اپنی مسرت کا اظہار کرتے اور خوب حوصلہ افزائی کرتے۔

ان کی آنکھوں سے جھلکتی ذہانت، ان کے ہونٹوں پر پھیلی ہلکی سی مسکان، جملوں کی برجستگی اور کاٹ کون فراموش کر سکتا ہے!

ایک بڑے تخلیق کار، ایک مخلص دوست اور مہذب انسان کا آج ہم سے جدا ہو جانا ایک الم ناک احساس ہے۔ اس دکھ کو بہر صورت ہمیں سہنا ہے، ان کے لیے دعا کرنا ہے اور ان کے فن اور شخصیت کے تاب ناک گوشوں کی کرنوں سے اپنی یادوں کو پرنور رکھنا ہے۔ یہی تو ہے جواب ہم کر سکتے ہیں۔ اب وہ اپنی زندہ تخلیقات کے ذریعہ ہمارے درمیان رہیں گے اور ہمیشہ رہیں گے۔

نقادانِ ادب نے ان کے بارے میں لکھا ''اعتبار ساجد کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے بیک وقت متنوع اصنافِ نظم و نثر کے لیے اپنے قلم کو استعمال کیا اور شاعری، کالم نگاری، ادبی مکالموں اور تحقیق کے علاوہ شعبہ تدریس اور ادبی صحافت میں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ اعتبار ساجد اپنے اندازِ سخن اور اسلوب بیان کے لحاظ سے ایسے منفرد شاعر ہیں جن کا مزاج عاشقانہ ہے، کیونکہ انھوں نے اپنی غزل کو تغزل کی پوری رعنائی اور نزاکتوں کے ساتھ سنوارا ہے ان کے ہاں عشق مجازی بھی ہے اور عشق حقیقی بھی۔ اسی لیے ان کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے اس بات کا احساس شدت سے ہوتا ہے کہ ان کے اندر ایک نرم و گداز شاعر چھپا بیٹھا ہے جو اپنا اظہار بڑی سادگی سے کرتا ہے۔''

ان کی کتابوں میں 'دستک بند کواڑوں پر'، 'آمد'، 'وہی ایک زخم گلاب سا'، 'مجھے کوئی شام ادھار دو' جیسے شعری مجموعے شامل ہیں۔

اعتبار ساجد صاحب کی رحلت کی خبر پا کر یہ چار مصرعے ہو گئے جو ان کے زندہ احساس کے بھی ترجمان ہیں اور میری جانب سے دوستانہ خراجِ محبت بھی ہیں:

دوستی کی بہار ساجد ہے
محفلوں کا وقار ساجد ہے
آبرو ہیں وہ حرف و معنی کی
شعر کا اعتبار، ساجد ہے

☆☆☆☆☆

''تتلی نگر''.....خوشیوں کا نگر

بچپن میں اپنے بزرگوں سے کہانیاں سننے، ان کہانیوں کے بارے میں سوچنے، ان سے سبق اور تفریح حاصل کرنے کا یہ دور اب ختم ہو رہا ہے۔ ایسے میں سلمان یوسف سمیجہ نے یہ خوب صورت کہانیاں لکھ کر بچوں کی تعلیم و تربیت کی ترویج میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ کہانیاں ہر عمر کے بچوں کی ذہنی سطح اور دلچسپی کو مدِنظر رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ آسان اور خوب صورت الفاظ سے کہانیوں کو مزین کیا گیا ہے۔ انھوں نے کہانی بُنتے ہوئے تخیل کے دھاگوں میں محبت، ہمدردی، محنت، دلجمعی اور عزت کے موتی پروئے ہیں۔ ان کی کہانیاں بچوں کی ذہنی بڑھوتری، تصورات اور اُردو زبان سیکھنے کا مؤثر ذریعہ ہیں۔

سلمان یوسف سمیجہ کی کہانیاں مطالعے کے شوق کو تیز تر کرتی ہیں۔ حیرت اور تجسس کا ایک جہاں سامنے کھل جاتا ہے۔ ان کی کہانیوں میں درختوں، پرندوں اور جانوروں سے محبت اور ہمدردی کی خوشبو ملتی ہے۔ سلمان ان کا درد اور دُکھ ایسے ہی محسوس کرتے ہیں، جیسے وہ ان کے ساتھی، ان کے اپنے ہوں۔ یوں لگتا ہے کہ سلمان نے ان کا ہاتھ تھام رکھا ہے۔ وہ جہاں جاتے ہیں، درخت، پھول، پرندے، جانور ان کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور انہیں ایک نئی کہانی کا تحفہ دے دیتے ہیں۔ ان کی کہانیاں ''مکپا چڑیا کا گھونسلا''، ''دو پھول''، ''تبریز کا جھولا''، ''پھولوں کی بیج اور سبزے کا قالین'' اور ''شانی ہتھنی'' بہترین مثالیں ہیں۔

انھوں نے اپنی کہانی ''بکرا عید کے دن'' میں قربانی کے دن انا، ضد اور ہٹ دھرمی کی قربانی کو بھی اصل قربانی قرار دیا ہے۔

سلمان یوسف سمیجہ نے انسانوں اور جانوروں کے علاوہ آبی حیات اور حشرات الارض کو بھی اپنی کہانیوں میں ایک نئے انداز اور روپ میں پیش کیا ہے۔ ان کہانیوں میں ان کے لیے بھی احساس اور محبت کے رنگ بکھیرے ہیں۔ ''گلاس میں کلاس'' چیونٹیوں کی ایک منفرد کہانی ہے۔ ''ہانی مچھلی'' ایک مچھلی کی ایکیوریم سے جھیل میں جانے کی فطری خواہش کو نمایاں کرتی ہے۔

غرض یہ کہ ہر کہانی ہمارے سامنے احساسات، حیرت اور مسرت کے کئی در وا کرتی ہے۔ ان کی انوکھی کتاب ''تتلی نگر'' دراصل خوشیوں کا نگر ہے۔ سلمان یوسف سمیجہ کو اتنی خوب صورت کہانیاں لکھنے پر مبارک باد۔

☆☆☆☆☆

مسرت کلانچوی

ساڑھے چار فٹ: ایک تجزیہ

اس افسانے کے خالق ہیں اعجاز روشن۔ ناول، شاعری اور افسانے کے ایک معتبر نام! آپ کئی اہم کتب کے مصنف ہیں۔ دس صفحات پر مشتمل یہ افسانہ پراسرار فضا میں ملفوف ہے! واضح رہے اس میں محیرالعقول/ خارق عادت کچھ نہیں۔ یوں اس کی سریت معمول کی تعریف پر پوری نہیں اترتی۔ اس کا بھید بھرا ماحول ہماری روزمرہ کی حیات کے اتنا نزدیک ہے کہ اس کی یہی قربت قاری کو ورطہء حیرت میں گم کر دے گی۔ ایک ایسے کردار کو مرکزہ بناتی ہوئی کہانی جسے چونکہ اپنے گرد و پیش میں آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے، اسی لیے وہ دید کا حصہ نہیں بن پاتا۔ کوئی گھاؤ، کوئی محرومی، کوئی خسارا جب ٹراما بن جائے تو کیسے انسانی نفسیات میوٹیٹ کر جاتی ہے۔ یہ جاننا ہو تو مذکورہ افسانے کے محوری کردار 'جھمورے' پہ کچھ دیر ٹھہرا جا سکتا ہے لیکن ذرا سی یہ رفاقت کافی عرصے کے لیے گلے کا ہار ہو جائے تو کیسا تعجب! کہ کون ہے جو اندر سے سالم ثابت ہے، سب ٹوٹے ہوئے ہیں اور اپنی شکستگی کو مخفی رکھنے کی اداکاری میں جو جتنا ہنرمند وہی سماج کا کامیاب فرد سمجھا جاتا ہے۔

جھمورے کی کہانی کا ملخص یہ وضع ہوگا کہ وہ ایک نسبتاً پست قامت شخص ہے۔ جسے اس کی بیوی 'بوجوہ' چھوڑ کر چلی گئی۔ دیگر رشتوں کے علائق سے بھی اسے قسمت نے بیگانہ

جمیل احمد عدیل

رکھا۔ یوں تنہائی نے آگے بڑھ کر اسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ قصباتی زندگی گزارنے والے اس آدمی کا کوئی خاص ذریعہء روزگار بھی نہیں۔ اس نے بھلے سمے کسی استاد سے ساجت/خدمت کے عوض ایک کرتب سیکھ لیا تھا۔ یہ آدمی مٹی کی تین چھوٹی چھوٹی پیالیاں اپنے پاس رکھتا۔ ایک پیالی کے نیچے فوم کی سرخ گیند ٹکائے پیالیوں کو سرعت کے ساتھ گھما کر آواز لگاتا:

آؤ قسمت آزماؤ!

سو روپے کی شرط لگاؤ!

پیسے کماؤ!

وہ سڑک کنارے مسافروں کے عام سے ہوٹل میں سب کے سامنے لال گیند پیالی کے نیچے رکھنے کے بعد تیزی اور مہارت سے تینوں اوندھی پڑی پیالیوں کی جگہ تبدیل کرتا چلا جاتا۔ طالع آزما اس کے جھانسے میں آ کر داؤ کھیلتے۔ ہار جاتے؛ پھر مقدر آزماتے؛ کئی بار آزماتے - چونکہ وہ ریاضت کے باعث Tricky ہو گیا تھا اس لیے جوا دوسرے ہی ہارتے - یوں گھاٹے سے ہر بار بچ جانا ہی اس کے رزق کی ضمانت بنا ہوا تھا۔ وقتی طور پر شکست خوردہ اپنے نقصان پر رنجیدہ بھی ہوتے ہوں گے پر اتنی معمولی رقم کا ضیاع سہولت کے ساتھ سہ جاتے۔ احساس زیاں ان کے ساتھ گھر واپس نہیں جاتا تھا۔

جمورے کی جس خو نے اس افسانے کو آرٹ کا اونچا درجہ دیا؛ وہ ہے اس کی: 'ناپنے کی عادت'؛ کافی مختلف عادت۔ جی ہاں! وہ ہر وقت جیب میں ایک فیتا رکھتا؛ جس کی مدد سے وہ آتے جاتے؛ چلتے پھرتے ہر اس چیز کی پیائش کرتا چلا جاتا؛ جو اس کے سامنے آ جائے۔ ذہنی سطح پر اس کا یہ 'کھسکاؤ' علاقے کے لوگوں کے لیے ایک شغل سا بن گیا اور جاننے والے اس کے ساتھ یوں چھیڑ خانی (Teasing) کا بہانہ ڈھونڈ لیتے۔ اپنی ناپنے کی اس علت کے ہاتھوں وہ ایک طرح سے کمپلسو ڈس آرڈر کا شکار تھا۔ نفسیات کی زبان میں اسے 'ہوس الحساب' یا قدرے بڑے مدار میں مجبوری کی جانچ پڑتال کا عارضہ (Ckecking Compulsion) سے بھی موسوم کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال یہ دونوں اصطلاحات او سی ڈی یعنی 'خبط آمیز اجباری ردا عمال' کی ذیلی اقسام میں شمار کی جاتی ہیں۔ بعض اوقات جمورے کی یہی Craving اس قدر بڑھ جاتی کہ وہ خطرہ مول لے کر بجلی کے اونچے کھمبے کی پیائش بھی کر ڈالتا۔ البتہ

جب وہ ایسی کسی مہم سے کامیاب لوٹتا تو Sense of Achievement سے خود کو سرشار محسوس کرتا۔ ہاں! یہ سرشاری کچھ ہی دیر اس کے من میں قیام کر پاتی۔ کیا ایسا ہونا بھی حقیقت کا آئینہ دار نہیں کہ ڈوپامین کی مقدار کا لیول کم ہوتے ہی انبساط غائب غلہ ہونے لگتی ہے اور اب تو یہ عمل اس قدر سریع ہو چکا کہ ہر آن ایک تازہ نشاط کی طلب لاحق رہتی ہے۔ اس ضمن میں سوشل میڈیا کا کردار کوئی راز نہیں رہا۔ اعجاز روشن نے کہانی کی ابتدا میں اسی سیاق کو پیش نگاہ رکھتے ہوئے موبائل فون کا انسانی زندگیوں میں دخیل ہونا مرقوم کیا ہے۔ فیتے اور سمارٹ فون میں تشابہ افسانے کی ندرت سے معمور جہت قرار پائے گی:

"فیتے کے بغیر وہ گھر سے نہ نکلتا تھا، جس طرح آج کل لوگ موبائل فون کے بغیر گھر سے نہیں نکلتے، اگر نکلیں تو انہیں خوف ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ کوئی ایسا حادثہ پیش آئے گا کہ وہ سڑک پر گرے ہوں گے اور انہیں کوئی نہیں پہچانے گا کہ کون ہیں، کیونکہ آج کل لوگ اڑوس پڑوس کے لوگوں سے زیادہ موبائل فون اور اس کی اقسام کو زیادہ پہچانتے ہیں، ایسے میں سڑک پر گرے پڑے ہونے کی صورت میں شناخت کا واحد ذریعہ موبائل فون ہی بچتا ہے۔ بالکل اسی طرح جھمورے کو موبائل فون سے بڑھ کر اپنے فیتے کی ہمراہی ضروری محسوس ہوتی تھی، جس سے وہ اپنے تئیں ہر چیز کی اوقات کا پتہ چلاتا تھا۔"

افسانہ نگار نے اس مناسبت سے ڈیجیٹل دور میں فرد کی قیود کے پہلو اجاگر کیے ہیں۔ فون سیٹ کے ماڈل/ برانڈ/ مالیت کا سوشل سٹیٹس سمبل ہو جانا اپنی جگہ! علاوہ ازیں اب تشخص کا پیمانہ بھی یہ سکرین رہ گئی ہے۔ اس کے جھوٹ کو سچ ماننے کی طرف رجحان نے صرف حقیقت سے دوری پیدا نہیں کی؛ رشتوں ناتوں کی نامیات کو بھی منہا کر دیا ہے؛ یوں اب خالی پن کو بھرنے کی خاطر جس سے مصنوعی سہارا پکڑا جا رہا ہے، اسپفر یب نظر کہیے۔ مکمل التباس نہ سہی، معتدبہ حصہ بہرحال Deception پر مبنی ملے گا۔

کچھ ایسے ہی خالی پن کا شکار افسانے کا کردار جھمورا نامی ہوا۔ اس کی طرف ابھی آتے ہیں۔ پہلے یہ زاویہ دعوت فکر دینا چاہے گا کہ مسئلہ کسی فلسفے کو افسانہ بنانے کا نہیں؛ کسی نادر فکری زاویے کا افسانے کے بطن سے برآمد ہونا ہے؛ یوں نظری مباحث پر فکشن کو اسی

لیے فوقیت حاصل رہی کہ اسے فرد بل کہ وجود اور سماج سے بلا واسطہ کشید کیا جاتا رہا۔ اس افسانے میں ایک مقام پر مرکزی کردار یہ تمنا کرتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز نئے سرے سے پیائش کے عمل کا حصہ بننی چاہیے۔ گویا ہمیں پہلے سے پیائشیں کر کے النفس و آفاق سپرد کر دیے گئے ہیں۔ یوں جو 'عقیدہ پسند' واقع ہوئے ہیں ان کی ہر خرخشے سے جان چھوٹ گئی مگر وہ جو اس فراہم کیے گئے 'پیکیج' پر خود کو مطمئن نہ کر سکے؛ انھیں تو یہ ساری حتمی/متعین صورتیں مضطرب کرتی رہتی ہیں۔ کیسا اتفاق ہے کہ یہی سوچ ایک فرزانے کا اثاثہ ملے گی اور اسی کو دیوانہ اپنا سرمایا یقین کرتا ہے۔ متذکرہ افسانے کے کردار کو دیوانہ دکھانا ہی دراصل فرزانگی ٹھیرے گی، یعنی تربیت یافتہ فن شناسی۔

فکشن کے سچ کو متداول سچ سے برتر دکھانے کی امنگ تو ہر افسانہ/ناول نگار کے دل میں جاگزیں رہتی ہوگی، پر کسی کسی کو توفیقات سے کام لینا آتا ہے۔ یہاں مابہ الامتیاز یہی پہلو قرار پائے گا کہ ایک ایسا فرد جو قدرے ابنارمل ہے، وہ اپنی خلوتوں میں عزم رکھتا ہے کہ موجودات اگر نئی پیائشوں کے بعد سامنے لائے جائیں تو معانی کس قدر بدل کر رہ جائیں گے۔ پھر وہ محض 'تصورات' کی دنیا کا باشندہ نہیں، اس کے ہاں تجربیت (Empiricism) بھی موثر ہے کہ جب تک وہ اپنے فیتے سے خود پیائش نہیں کر لیتا، اسے طمانیت نہیں ملتی۔ اب یہ سوال اس سے اگلے مرحلے کا ہے کہ جو فیتا اس کے پاس ہے، وہ جن عددوں اور درمیانی فاصلوں کا پیش کنندہ ہے، اس شماریات پر کیا سب متفق ہیں؟ اگر بالفرض ایسا ہو بھی تو پھر 'سٹینڈرڈ' مساحت کہاں ہے؟ یہاں کیا فرد کی فردیت اثبات سے ہمکنار نہیں ہو رہی کہ سکیل ایک ہونے سے کیا ہو جاتا ہے، اپنے اپنے سچ کی حقانیت کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ اپنی اپنی یارڈ سٹک صرف محاورے میں اسیر نہیں۔ اضافیت کی مطلقیت نے اس افسانے کے پہلو سے نکل کر ریڈر کو چونکا دیا ہے۔ امر واقع یہ قرار پائے گا کہ Objectivity ایک درجے میں سدا Subjectivity کے ماتحت رہی لیکن جنھیں اپنی ترجیحات پر معاشرے کو چلانا ہے اور زمام اپنے ہی ہاتھ میں رکھنی ہے وہ کب از سر نو پیائش کا اذن دے سکتے ہیں۔

انھوں نے اشیا و مظاہر کے متعلق طول، عرض، حجم، وزن -- سب گن من رکھا ہے

بل کہ تمام معاشرتی قدریں، جملہ سوچیں، فکریں، نظریے، عقیدے--- غرض سب کچھ ان کے میٹر کا قیدی جانیے- یوں ہرگز کسی نئے گز، کسی نئی پیائش کی گنجائش نہیں- اگر سوسائٹی میں شمشاد رنگ ہونا، مردانہ حسن کا پیمانہ مقرر ہوگیا ہے تو کوتاہ قد کا مالک خود کو عمر بھر کے لیے کہتری کے احساس میں گرفتار سمجھے- سرو قامتی پر اب ہر صالحیت و صلاحیت قربان! یوں بالشیتا، بونا، ٹھگنا، ناٹا، پودنا، ٹینا، فتنہ وغیرہ تحقیری صیغے باجواز ہو گئے- اگر کسی دانا نے کہا بھی کہ انسان کا قد کندھوں کے اوپر ناپنا چاہیے! تو اس کا فرمودہ ہوا میں اڑا دیا گیا- فرد بس عدد ہے- اس کی متعین شکل ہی قابل قبول ہوگی- جیومیٹری ہی فائق علم ہے، یوں ہندسہ حکومت کرے گا کہ وہ بے لچک حقیقت جو ٹھہرا، لفظ کا کیا ہے جو تعبیر کے عنوان سے اپنے مفاہیم بدلتا رہتا ہے- اقتدار مستقل مزاج کے ہاتھ میں ہونا/ رہنا چاہیے: زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد! سر کا نو یا پاؤں سے پکڑ کر کھینچو، ہر کسی کا قد چارپائی کے برابر کر دو! قانون ہو تو ایسا! جب بھرتی کرنا/ ہونا ہی سماج میں افضل عمل ٹھیرا تو پھر پیائشوں کی غلامی قبول کرنا پڑے گی___ ایسے میں کون بتائے سمجھائے کہ زندگی بحرِ بے کراں ہے، پٹوار خانہ نہیں جبکہ یہاں گرد آور (گرداور) کی شان کے مقابل سیاح کا مرتبہ کہیں نیچ! گشت اعلا سیاحت ادنا!

کہانی اس وقت فیصلہ کن موڑ کاٹتی ہے جب جھمورا اپنی معمول کی زندگی سے سخت بیزار ہوگیا- یوں وہ ایک روز اس وحشت سے عارضی چھٹکارا پانے کے لیے گھر سے نکل کھڑا ہوا اور منزل کا تعین کیے بغیر ایک لاری میں سوار ہو کر کسی بعید اجنبی قصبے کے پاس جا اترا: ''قصبے کے شور سے دور خاموش اور وسیع سرمئی فضا میں سیاہ بادلوں کے نیچے خوب صورت موسم میں اسے کھلے پن کا احساس ہو رہا تھا-'' پیدل چلتے چلتے وہاں پہنچ جاتا ہے جہاں کچھ لوگ ایک قبر کی کھدائی میں مصروف ہیں- اسے 'عرض ہنر' کا جو قدرتی موقع ملا تو گورکنوں کو متوجہ کرتا ہے کہ قبر کی لمبائی کم ہے- وہ آپس میں بحث کرتے ہیں- آخر اس کے جیبی فیتے پر مثبت اعداد جیت کر اسے سرخرو ٹھیراتے ہیں- یوں اسے چھوٹا / کاکا / لڑکا/ چھوکرا وغیرہ کے تصغیری تخاطب کی تکلیف تحلیل ہوتی محسوس ہونے لگی- وہاں سے آگے بڑھتا ہے تو بارش کے نتیجے میں پیدا ہونے والی پھسلن سے اس کا پاؤں اچانک رپٹ گیا اور یہ نیچے گڑھے میں گر کر سر کو خون آلود اور پسلی کو

زخمی کرا بیٹھا؛ لیکن اس حادثے کے باوجود نظروں ہی نظروں میں Measurement کر کے آسودہ ہو گیا کہ اسے پندرہ فٹ کی اونچائی سے گرنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔

تکان سے چور اور مجروح بدن کے ساتھ گاؤں کی ایک ریستوران نما دکان میں پہنچ کر رین بسیرے کا طالب ہوا تو دکاندار نے ترس کھا کر اسے وہاں رات گزارنے کی اجازت دے دی مگر سرِشام احتیاطاً اسے اندر بند کر کے دروازے کو باہر سے تالا لگا کر اپنے گھر روانہ ہونا مناسب سمجھا تا کہ چوری وغیرہ کے احتمالی نقصان سے بچا جا سکے۔

اب یہ جھورا کراہتا ہوا پہلے تو کچھ دیر کرسی پہ براجمان رہا پھر مزید تھک گیا تو کونے میں پڑی چارپائی پر دراز ہونے کا ارادہ کیا لیکن لیٹنے سے پیشتر وہ اس چارپائی کی پیمائش سے غافل نہیں ہوا۔ جب اپنی مہارت آزما چکا تو وہ ساڑھے چار فٹ نکلتی ہے نیز فیتا ذرا سا ٹوٹا ہونے کے باعث اس سے آگے حرکت سے منکر ہو کر اشارا دیتا ہے کہ اسے علامت سمجھو! جو ہونے والا ہے، اسے جانو!

افسانے کی ایک اہم بل کہ مسلمہ خوبی یہ سمجھی گئی کہ اس کا متن حشو و زواید سے منزہ ہوا کرتا ہے۔ افسانہ نگار نے درحقیقت ابتدا ہی میں مذکورہ مرحلے کو کھول دیا تھا۔ یوں اس مقام پر قاری جست بھر کر جب پیچھے جاتا ہے تو وہ اپنے وجود میں لطف کی مقدار کو بڑھتے ہوئے محسوس کرتا ہے:

''پرانا ہونے کے باعث فیتے پر پہلے اڑھائی فٹ کے نمبر تقریباً مٹ چکے تھے اور ٹھیک ساڑھے چار فٹ پر جا کر فیتہ ایک طرف سے کٹ گیا تھا جہاں سے وہ بند کرتے ہوئے اٹک جاتا تھا جسے جھورا ہاتھ سے سیدھا کر کے فیتے کی ڈبیا میں انچ بہ انچ واپس گھسیڑ کر بند کرتا تھا۔''

جب ماندگی بہت غالب آ گئی تو وہ اسی چھوٹی سی چارپائی پر سو گیا۔ اس اثنا میں دو چور آن دھمکتے ہیں۔ جنھیں اٹھل پتھل کے دوران جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ سونے والا تو ابدی نیند سو چکا ہے۔ یوں وہ خوف کے مارے وہاں سے کچھ چرائے بنا سکنے میں عافیت جانتے ہیں۔ البتہ وہاں سے نکلتے ہی حیرت کا اظہار کیے بنا نہ رہ سکے تھے کہ چارپائی اور اس پر لیٹا ہوا پردیسی دونوں بالکل پورے پورے کیوں ہیں!؟!

''مگر ٹھہرو یہ فیتہ اس کے پاس کیوں رکھا ہے؟ اس (چور) نے کھلا ہوا فیتہ اٹھا کر دیکھا جو ساڑھے چار فٹ پر اٹکا ہوا تھا۔ یکدم غیر محسوس طور پر اسے لگا کر فیتے کے

نیچے دکھائی دینے والی چارپائی اور اس پر پڑا مردہ اسی سائز کے تھے جہاں سے اس وقت فیتہ اٹکا ہوا تھا۔ اس نے فیتے والا ہاتھ مزید نیچے کیا اور پریشان سا ہو گیا: یار کمال ہے! لوگ اب بندے کو ناپ تول کر قتل کرنے لگے ہیں کیا؟ ساڑھے چار فٹ کا چھوٹا سا بندہ پھڑکانے کی کیا ضرورت پڑ گئی تھی؟''

افسانے میں جھمورے کی آخری خود کلامی 'پنچ لائن' ثابت ہوئی کہ وہ اپنے آپ سے ایک مرتبہ پھر یہ سوال پوچھتا ہے: آخر اس کی بیوی اسے چھوڑ کر کیوں چلی گئی تھی؟ اس سوال کا جواب باہمی مکالمے میں ان دو چوروں نے دے دیا: اتنے چھوٹے قد کے آدمی کو تو اس کی بیوی چھوڑ کر بھاگ جاتی ہوگی!

اگر وہ دانشور چور باہر گلی کے بجائے دکان کے اندر عین اس کی موجودگی میں بھی یہ تبصرہ کرتے تو جھمورا یہ سن نہ پاتا کہ اس وقت تک موت کی مہربانی سے اس کی حس سامعہ بھی بند ہو چکی تھی۔ پیائش کی Addiction کا عقدہ کھل گیا۔ انسانی لاشعور واقعی خواص کا مصدر ٹھہرا۔ جانے اس جہان میں کیا کیا چھپا بیٹھا ہے۔

اعجاز روشن صاحب کا افسانہ: 'ساڑھے چار فٹ' پڑھ کر جیسے دل یکدم مٹھی میں آ گیا کہ زندگی کس طرح کی بنائی گئی ہے! کیسی بے رحم ساخت ہے اس کی۔ درد و الم کی لہروں کو جمع کر کے اسے زیست سے موسوم کر دیا گیا ہے: لو! اب جھگڑتے رہو تقدیر سے! چاہے کوئی اسے آزمائش کہہ کر پیائش کرتا پھرے، بھلے ہی کوئی اسے بے بسی کا عنوان دیتا پھرے! یہ ایسی ہی بے ڈھب، کڈھب، بے حس، اذیت رساں رہے گی۔ پیدائش بھی تو ایک جبر ہے اور اس جور و جفا کی پیائش کسی سے کہاں ہو سکی! جنھیں اس شبھ گھڑی سونے کا چمچ مل گیا وہ کبر میں پلے بڑھے، جنھیں ناداری بخت میں ملی یا کوئی جسمانی کمی تو وہ اب زندگی کے میدان کارزار میں جیتیں یا ہاریں، جییں یا مریں، کسی کو اس سے کیا! دھرم گیانی تسلیاں دے دیں گے، آگے جا کر کمپنسیشن مل جائے گی، موٹیویشنل اسپیکروں کی سن لیں تو وہ چرب زبانی کے ذریعے قوت ارادی کو بروئے کار لانے کی پرجوش تلقین سے جذبہ ساطاری کر دیں گے۔ جس کا تاثر بس چند لمحوں کا مہمان بن کے رہنا پسند کرتا ہے۔ تقریر کی لذت مقرر کے ساتھ ہی رخصت ہو جایا کرتی ہے۔

اس افسانے کا خاص حصہ وہ ہے جہاں کردار دوسرے گاؤں میں ان واقعات و

حالات کے سپرد ہو جاتا ہے، جنھیں تقدیر کی Occurring سے تعبیر کرنا پڑے گا۔ کسی فلسفی کا کہنا ہے: 'مستقبل نرا پرا Determinism ہے۔' اگلی گھڑی کیا لائے گی، قطعیت کے ساتھ کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اسی نادیدہ ساعت نے مذہب کو جنم دیا۔ صرف مذہب ہی کو کیوں، الحاد کی آفرینش بھی اسی سے ہوئی۔ اس لیے کہ جو لمحہ کرب لائے گا وہ یکساں ایذا کا باعث ثابت ہوگا۔ اگر کوئی سوچے تو Misery ہر دو صورتوں میں ایگزسٹ کر رہی ہے، پھر کیا اب تلک صرف Interpretation ہی کا چوائس دستیاب کیا جا سکا؟ بعض اوقات تو فرد کو ایسا ہولناک پیش آتا چلا جاتا ہے کہ وہ ششدر ہو کر رہ جاتا ہے! یہ سب کیا اور کیوں؟ ریشنلزم کی افادیت سے انکار نہیں کہ جیون میں یہ آسانیاں لانے کا عزم رکھتا ہے۔ تاہم اس کا کیا کریں کہ سارے پلس مائنس کر کے بھی وہ کچھ ہو کر رہتا ہے جو سان گمان میں نہیں ہوتا۔ نامعلوم اسباب کی دنیا کو کب، کہاں اور کون کون ترتیب دیتا ہے کہ انجان/ بے خبر کو مقام حادثہ پر کھینچ کر لے جا بس کیا جاتا ہے۔ اس نقطے تک 'پہنچ' کو ممکن بنانے کے لیے ان گنت عوامل کا مرتب ہونا بھی ایک صورت حال سے تعبیر ہوگا اور یہ ہونی شدنی Chain of Actions سے موسوم ہوگی۔ رخنوں سے پاک/ Fool Proof یہ سارا تفاعل کیا محض کسی کی بے چارگی کا تماشا دیکھنے کے لیے وقوع میں لایا جاتا رہا؟ حساس شخص جس کا نام سننا گوارا نہیں کرتا اس مفسد کو بھری بزم میں روبرو لا کر بٹھا دیا جاتا ہے۔ اب اُس منفی آدمی کا وہ کیا کرے! اسے کم حوصلگی کہہ لیجیے مگر وہ شاکی زیر لب استفسار کیے جاتا ہے کہ ان رکوع و سجود اور اوراد و وظائف کا کیا ہوا، جنھیں رد بلا کی غرض سے بارگاہ میں پیش کیا گیا تھا؟ رہا امتحان اور اس کی عظیم معنویت تو اے دیوتا! وہ کب امیدوار بنا تھا؟ کب اس نے شوق ابتلا کا اظہار کیا تھا؟

کیا کیا جائے سائنس کی بے پناہ ترقی کے باوجود 'ہم وقتیت' (Synchronicity) کے بھید سے پردہ نہ سرکایا جا سکا۔ کہہ لیجیے کہ ایسا ہونا 'محض اتفاق' ہے۔ اس تشریح سے کیا وقوعے کی اذیت کم ہو جائے گی؟ جو جان پہ گزر گئی، وہ تو بہرحیث گزر گئی! کسی خاص Driving Force کا کارنامہ نہ سہی، ہونیت کے عذاب سے مفر کی صورت تو برآمد نہ ہو سکی۔ کیا کوئی ایسا دھرم ممکن ہے،

جس کے مطابق پرستار بے نقص پوجا پاٹھ مکمل کر لے اور بدلے میں اسے یہ ضمانت فراہم کر دی جائے کہ اب تمھاری زندگی میں دکھ نہیں آئے گا؟

باقی یہ غالباً ایسی دور کی بات نہیں کہ کوئی شخص تنہا ہو تو وہ 'ایک مرضی' کے تابع ہوتا ہے، جیسے ہی وہ باہر قدم دھرے گا معروض میں ان گنت مرضیوں کو فعال پائے گا اور ان مرضیوں کے مالکوں یعنی خداوں میں کوئی خود کو کسی سے کمتر گمان نہیں کرتا؛ پر ہوتا یہی آیا کہ جو خدا زیادہ قوت والا؛ رسوخ والا ہوتا ہے وہ دوسرے کو کچل کر رکھ دیتا ہے اور کبھی یہ جابر خدا ایکا کر کے بھی کسی کو نیست و نابود کر کے رکھ دیتے ہیں۔ ایسا انفرادی سطح پر بھی رونما ہوتا آیا اور ریاستی سطحوں پر بھی۔ عالمی طاقتوں کی سفاکی بھلا کب کسی کی آنکھوں سے چھپی ہوئی ہے۔ کیا ساری جزا سزا جہان فردا ہی میں؟؟؟ مان لیا کہ یہ امید کا منطقہ ہوگا مگر وہ جو تاریک راہوں میں مارے گئے؟ 'قصہ زمین برسر زمین' کی آرزو کو کوئی کہاں لے جائے!

اس افسانے میں ماجرا ایسے بہاو کا حامل ہے کہ قاری کا دھیان پلاٹ، تکنیک، اسلوب، ٹریٹ منٹ ایسی اکائیوں کی جانب منتقل ہی نہیں ہو پائے گا۔ تخلیق اگر 'وحدت' کا حقیقی وصف رکھتی ہو تو پھر سب کچھ اسی کے اندر موجود ہوا کرتا ہے؛ اچھی طرح گندھی ہوئی حالت میں؛ نہ کسی جزو کو علاحدہ کرنے کی احتیاج ہونی چاہیے نہ دیکھنے کی خواہش۔ اس کی کلیت ہی سے مستفید ہونا لطف عطا کرتا ہے اور یہ افسانہ اپنے غایت منفرد موضوع کے سبب کرب کا مظہر سہی لیکن خواننده کے لیے انجذاب کے وصف سے متصف ہے۔

اعجاز روشن صاحب! آپ نے اس اعلامتن کے ذریعے اردو افسانے کو مزید موقر کر دیا ہے!!!

حواشی

ا اس کردار کا اکیلے سفر کرنا، تنہائی کے المیے کو سامنے لا رہا ہے۔ وہ جہاں جیون بتا رہا تھا وہاں بظاہر لوگوں کے بیچ رہتا تھا لیکن اس کا کوئی دوست، کوئی مونس نہیں تھا۔ گھر میں بھی تن تنہا اور باہر بھی اکلاپے کا شکار! اپنی سنسان ذات کو لیے اداسی کا مداوا کرنے نکلنا ٹریجیڈی کا مظہر ہے، یوں افسانہ نگار سماج کے اس رخ کو نمایاں کر رہے ہیں کہ ہم جنھیں خوش باش اور لوگوں میں گھرا ہوا پاتے ہیں، ممکن ہے انھیں تنہائی کا ناگ ڈس رہا ہو مگر کسی کے پاس توجہ کی فرصت نہیں۔

☆☆☆☆☆

کون گلی گیو.....

گلی کا استعارہ: کلاسیکی سے جدید شاعری تک اور نوید صادق کا شعری تناظر.....

اُردو شاعری کی جمالیات میں چند الفاظ بار بار نئے معانی کے ساتھ سامنے آتے ہیں ''گلی'' میں ایسا ہی ایک لفظ ہے، جس نے مختلف ادوار اور شعری رویوں میں الگ الگ علامتی جہات اختیار کی ہیں۔ عام زندگی میں گلی ایک جغرافیائی حقیقت ہے۔ گھر سے نکلنے اور کسی منزل تک جانے کا راستہ۔ لیکن شاعری میں یہ ''راستہ'' صرف مکانی نہیں رہتا بل کہ جذبات، یادوں، رسوائی، قربت، تنہائی اور وجودی سوالات کا ظرف بن جاتا ہے۔

صاحبو، غور کریں تو یہ بھید کھلتا ہے کہ یہ لفظ، یہ شبد، یہ استعارہ، یک گوہرِ شب تاب، ''گلی'' ایسا ''پنتھ'' ہے جو رہروانِ راہِ سخن کو ان کی منزل سے باسہولت ہم کنار کرتا ہے۔ گو ہمارا مقصد یہاں اردو شاعری میں اس استعارہ کا بھید بھاؤ ہے، مگر جو ذرا اک نگاہ کریں تو ہندی و پنجابی اور شاید ہندو پاک کی دیگر زبانوں میں بھی ''گلی'' کا استعارہ اپنے رنگوں کی بہار دکھاتا ہوا پائیں گے۔

ایک طرف، راجستھان کا لوک گیت پکارتا ہے'' کون گلی گیو شیام'' تو ادھر، میرا بائی' کی ورد جدائی میں ڈوبی کراہ کان پڑتی ہے ''گلی تو چاروں بند ہوئی، میں ہری سے ملوں کیسے جائے۔'' تو یہاں پنجاب میں ''حافظ برخوردار'' کی صاحباں ''حجرے شاہ مقیم' عرضیاں ڈال رہی ہوتی ہے۔

''سنجیاں ہو جان گلیاں.....''

طارق بٹ

''گلی'' کی معنوی دنیا کم از کم تین بڑے دائرے بناتی ہے:

محبت اور وصال کی گلی (جہاں عاشق محبوب تک کھنچتا ہے)

سماجی و داخلی گلی (جہاں یاد، تنہائی اور وقت کا کرب ہے)

اس مضمون میں ہم دیکھیں گے کہ میر اور غالب جیسے کلاسیکی شعرا سے لے کر ناصر کاظمی، جون ایلیا، پروین شاکر اور دیگر جدید شعرا تک ''گلی'' کس طرح معنوی ارتقا سے گزرتی ہے، اور پھر نوید صادق کے ہاں یہ استعارہ کس نئی داخلی اور فلسفیانہ جہت کو اختیار کرتا ہے۔

اردو کلاسیکی شاعری میں ''گلی''

میر تقی میر: عشق اور رسوائی کی گلی

میر کے ہاں ''گلی'' اکثر محبوب کی طرف کھنچنے والے راستے اور عاشق کی مجبوری کا مقام ہے:

چلا نہ اٹھ کے وہیں چپکے چپکے پھر تو میر
ابھی تو اُس کی گلی سے پکار لایا ہوں
یا
دل مجھے اس گلی میں لے جا کر
اور بھی خاک میں ملا لایا

.....

یہاں ''گلی'' محبوب کی طرف جانے کی ایسی سرزمین ہے جہاں عاشق بار بار لوٹتا ہے۔ میر کے لیے یہ گلی ایک طرف قربت اور کشش کی علامت ہے، اور دوسری طرف رسوائی اور امتحان کی۔

غالب: طنز اور عزتِ نفس کی گلی

غالب نے ''گلی'' کو عشق کی رسوائی سے نکال کر ایک سماجی اور تہذیبی معنی دیا ہے:

ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

.....

اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعد قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

.....

غالب کے ہاں گلی محبوب کی قربت کا مرکز نہیں بل کہ ایک طنزیہ منظر ہے جہاں عزتِ نفس اور سماجی طعنہ اہمیت رکھتے ہیں۔ یوں ان کی ''گلی'' فرد اور سماج کے تعلق کی نشانی بن جاتی ہے۔

جدید کلاسیکی اور رومانوی شعرا میں ''گلی''

ناصر کاظمی: نوستالجیا اور تنہائی کی گلی

ناصر کاظمی نے ''گلی'' کو ماضی کی یاد اور تنہائی کے استعارے میں بدل دیا:

تو ہے اور ہے خواب دریچے
میں ہوں اور سنسان گلی ہے

.....

یہاں گلی ایک ویران ماضی کی بازگشت ہے

جو قاری کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ ناصر کی گلی میں ہلچل نہیں مل کہ سناٹا ہے، اور یہی سناٹا نوستالجیا کو جنم دیتا ہے۔

احمد فراز: واپسی کی مشکل گلی فراز کے ہاں ''گلی''، محض یاد نہیں بل کہ فیصلہ کن موڑ ہے:

تو بضد ہے تو جا ، فراز مگر
واپسی اس گلی سے مشکل ہے

.....

یہاں ''گلی'' ایک ایسا راستہ ہے، جہاں قدم رکھنے کے بعد واپسی ممکن نہیں رہتی۔ یہ زندگی کی ناقابلِ واپسی کیفیت کا استعارہ ہے۔

شکیب جلالی اور خورشید رضوی

شکیب جلالی کی گلی اجنبیت اور سایوں سے بھری ہے:

وہاں کی روشنیوں نے بھی ظلم ڈھائے بہت
میں اس گلی میں اکیلا تھا اور سائے بہت

.....

جبکہ خورشید رضوی نے ''دل'' کے لیے کہا:

اس گلی کے دوسری جانب کوئی رستہ نہیں

یعنی گلی وجودی قید کا استعارہ ہے، ایک داخلی راستہ جس کا اختتام باہر نہیں بل کہ اندر ہے۔

جدید اور مابعد جدید شعرا میں ''گلی'' بے بسی اور وقت کا المیہ

جون ایلیا کے ہاں ''گلی'' جدائی، کھو جانے اور بے بسی کی علامت ہے:

اس گلی نے یہ سن کے صبر کیا
جانے والے یہاں کے تھے ہی نہیں

.....

یہاں گلی وقت کی بے رحمی اور نا تمام کہانیوں کی یادگار ہے۔

پروین شاکر کی ''گلی'' یادوں سے بھری ہے:

یادوں کی آباد گلی میں
گھوم رہا ہے تنہا چاند

.....

یہاں گلی ایک ذاتی کائنات ہے جہاں یادیں روشنی اور تنہائی دونوں کو اکٹھا کرتی ہیں۔

گلزار اور محمد علوی

گلزار نے ''بیتی ہوئی گلیوں'' کا ذکر کر کے ماضی کی بازیافت کا استعارہ قائم کیا۔ محمد علوی کے ہاں گلیاں زندگی کے الجھاؤ اور سماجی رشتوں کی پیچیدگی کو ظاہر کرتی ہیں:

اپنا گھر آنے سے پہلے
اتنی گلیاں کیوں آتی ہیں
محمد علوی

ان دنوں گھر سے عجب رشتہ تھا
سارے دروازے گلے لگتے تھے
رہ سمجھتی تھیں اندھیری گلیاں
لوگ پہچانے ہوئے لگتے تھے
محمد علوی

گلزار کہتے ہیں:

''بیتی ہوئی گلیوں سے پھر سے گزرنا''

اردو شاعری میں ''گلی'' کا استعارہ ایک طویل ارتقا سے گزرا ہے۔
میر کے ہاں یہ عشق و رسوائی کی جگہ ہے۔ غالب کے ہاں طنز اور عزتِ نفس کا مرکز۔ ناصر کاظمی کے ہاں نوستالجیا اور سناٹے کا استعارہ، جون ایلیا کے ہاں جدائی اور وقت کی بے بسی کی علامت، پروین شاکر اور گلزار کے ہاں یاد اور ماضی کا استعارہ۔
یوں ''گلی'' محبوب کے محلے سے نکل کر انسان کے وجود کے اندر اُتر آتی ہے۔ یہ استعارہ نہ صرف اردو شاعری کے کلاسیکی اور جدید رویوں کا سفر دکھاتا ہے بل کہ انسان کے داخلی کرب، وقت کی بے رحمی اور فنا کے فلسفے کو بھی مجسم کر دیتا ہے۔ ہم دیکھیں گے کہ نوید صادق نے وجودی کرب، داخلی اور اجنبیت اور یاد کے خلا کے استعارے کو کس قدر وسیع اور گہرا بنایا ہے، یہاں ''گلی'' ایک کائنات ہے جس میں محبوب بھی ہے، سماج بھی، وقت اور فنا بھی۔
نوید صادق کی شاعری میں ''گلی'' محض ایک مقام یا جغرافیائی اکائی نہیں بل کہ یاد، رفاقت، تنہائی، جدائی، وقت کے گزرنے اور خود اپنی ذات سے مکالمے کا ایک استعارہ ہے۔ اس کے مختلف رنگ اور پرتیں سامنے آتی ہیں۔ آیئے چند نمایاں جہتوں پر نظر ڈالتے ہیں:

1- یاد اور وصل کی گلی

یاد نہ آ سکوں تو بول، رنگ پڑا دریچہ کھول
تیری گلی میں کون تھا، تیرے لبوں پہ کیا تھا میں

.....

یہاں ''گلی'' محبوب کی دنیا کا استعارہ ہے جہاں عاشق اپنی پہچان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''دریچہ'' وقت اور یاد کے زنگ آلود ہونے کی علامت ہے، ''گلی'' اس پرانی قربت اور استعارہ ہے جہاں عاشق اپنی موجودگی اور معنی پاتا تھا۔

2- تنہائی اور خود سے جدائی کی گلی۔

دیکھ، گلی میں کون ہے؟ کوئی نہیں ہے! سنتا ہوں، چند سال قبل، خود سے بچھڑ گیا تھا میں

.....

یہاں گلی خالی ہے، صرف ''آہٹیں'' باقی ہیں۔ استعارہ خود اپنی ذات کی اجنبیت اور بچھڑنے کا ہے۔ ''گلی'' ایک ایسا خلا ہے، جہاں ماضی کی آوازیں گونجتی ہیں مگر کوئی موجود نہیں۔

3- سرگوشیوں اور راز کی گلی،

گلی کے موڑ پر سرگوشیاں ہوئیں کچھ دیر
اور اس کے بعد کوئی چل پڑا ہمارے ساتھ

یہاں ''گلی کا موڑ'' راز کے لمحے اور ایک نئے سفر کی علامت ہے۔ استعارہ ملاقات کے بعد بدلنے والی کیفیت کا ہے، جیسے کسی

نے زندگی کی گلی میں قدم رکھا ہو۔

4- چرچا اور سماجی دباؤ کی گلی۔

بچھڑنا یوں ضروری ہو گیا تھا
گلی کو چوں میں چرچا ہو چلا تھا

.....

یہاں ''گلی'' محض محبوب یا تنہائی کا استعارہ نہیں بل کہ سماج کا بھی ہے۔ گلی کوچے لوگوں کی زبان اور گپ شپ کے استعارے ہیں جنھوں نے جدائی کو ''ضروری'' کر دیا۔

5- یاد اور روشنی کی گلی

گلی میں رات کو کون تھا، بتا ، نوید
چراغ سے چراغ جو بدل گیا

.....

یہاں ''گلی'' روشنی اور تبدیلی کی علامت ہے۔ کوئی موجود تھا جس نے تسلسل توڑا اور چراغ سے چراغ بدلنے کا استعارہ نئی شناخت یا نئے رشتے کا اشارہ ہے۔

6- ویرانی اور سناٹے کی گلی۔

آخر آخر بھی یاد آتا رہا
اوّل اوّل گلی کا سناٹا

.....

یاد کے آغاز اور اختتام میں ''گلی'' کا سناٹا مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔ یہ سناٹا وقت کے خالی پن اور دل کی ویرانی کا استعارہ ہے۔

7- داخلیت یا اپنی شناخت کی گلی۔

وہ شہر، وہ گلی تو مرے دل پر نقش ہے
صدیاں بھی کم پڑیں گی اُسے بھول جانے میں

.....

یہاں ''گلی'' ایک فرد کی داخلی تاریخ اور وجود کی شناخت ہے۔ شہر اور گلی دل پر ''نقش'' ہیں، جنھیں صدیوں میں بھی نہیں مٹایا جا سکتا۔

خالد احمد کی یاد اور گلی کا ربط،

خالد احمد یاد آتے ہیں مجھے جب بھی نوید
ان در و دیوار، ان گلیوں سے مل آتا ہوں میں

.....

یہاں ''گلی'' محض ایک پرانی محبوبہ کا استعارہ نہیں بل کہ ادبی یادداشت اور شعری ورثے کی علامت ہے۔ خالد احمد کے ساتھ گلی تخلیقی ربط قائم کرتی ہے۔

9- رنج و الم کی گلی۔

خاموش ہیں اس گلی میں سب لوگ
دن رات پڑے کراہتے ہیں

.....

یہاں ''گلی'' رنج و الم کی کیفیت کا استعارہ ہے۔ کراہیں انسانی وجود کے درد کی علامت ہیں۔

10- فنا اور مٹی کی گلی۔

تم مری خاک جو گلیوں سے اٹھا لائے ہو
یہ تو بتلاؤ، تمھیں کوزہ گری آتی ہے

یہاں ''گلی'' فنا، خاک اور مٹی کے سفر کی

علامت ہے۔ استعارہ ''وجود کے مٹی ہو جانے'' اور ''از سرِ نو تخلیق'' کا ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ نوید صادق کے ہاں ''گلی'' کبھی محبوب کی قربت ہے، کبھی ماضی کا دروازہ، کبھی ویرانی، کبھی راز، کبھی سماج کی نظر، اور کبھی وجود کی فنا کا استعارہ۔ یوں ''گلی'' کا استعارہ ان کی شاعری میں ایک مکمل کائنات بن جاتا ہے جو ذاتی، اجتماعی اور وجودی سطحوں پر حرکت کرتی ہے۔

اور اگر ہم نوید صادق کی شاعری میں ''گلی'' کو زمان و مکان کے پیرائے میں دیکھیں تو کچھ نئی جہتیں سامنے آتی ہیں۔

1- گلی بطور کوزہ وقت

گلی محض ایک جغرافیائی اکائی نہیں، بل کہ ماضی کا وقت اپنے اندر محفوظ رکھنے والا ظرف ہے۔

آخر آخر بھی یاد آتا رہا
اوّل اوّل گلی کا سناٹا

یہاں ''گلی'' وقت کے دونوں کناروں (ابتداء اور انتہا) کو سمیٹے ہوئے ہے۔ اس سناٹے میں وقت کا بہاؤ بھی ہے اور ماضی کی گرفت بھی۔

2- گلی بطور مکانی یادداشت۔

وہ شہر، وہ گلی سو مرے دل پہ نقش ہے
صدیاں بھی کم پڑیں گی اُسے بھول جانے میں

یہاں ''گلی'' ایک ایسی یادداشت ہے جو دل پر کندہ ہے۔ صدیوں کا وقت بھی اس نقش کو مٹا نہیں سکتا۔ یہاں فرد کا وجود اور وقت اکٹھے محفوظ ہیں۔

3- گلی میں فرد اور سماج کا ٹکراؤ۔

بچھڑنا یوں ضروری ہو گیا تھا
گلی کوچوں میں چرچا ہو چلا تھا

.....

یہاں ''گلی'' صرف عاشق اور محبوب کا مقام نہیں بل کہ سماجی مکالمے کی جگہ ہے۔ گلی کے ''چرچے'' وقت کو فیصلہ کن بنا دیتے ہیں۔ یعنی گلی میں ''وقتِ سماجی'' اور ''مکانیِ شخصی'' آپس میں جُڑ جاتے ہیں۔

4- گلی بطور تنہائی کے ''زمان و مکان،

ع

دیکھ، گلی میں کون ہے؟ کوئی نہیں ہے! آہٹیں!

.....

یہاں گلی موجود تو ہے مگر ''خالی'' ہے۔ صرف آہٹیں باقی ہیں جو ماضی کی بازگشت ہیں گویا ایک 'قولِ محال' ہے کہ موجود لمحہ خالی ہے، مگر ماضی کی صدائیں اس کو بھرتی ہیں۔ یوں گلی ''خالی جگہ + یاد کا وقت''، زمان و مکاں، کا استعارہ بن جاتی ہے۔

5- گلی اور وجودی سفر۔

تم مری خاک جو گلیوں سے اٹھا لائے ہو
یہ تو بتلاؤ ، تمھیں کوزہ گری آتی ہے

.....

یہاں 'گلی' مٹی اور فنا کی علامت ہے۔ وجودی وقت (زندگی، مٹی، دوبارہ تخلیق) اور مکانی حقیقت (گلی کی مٹی) اکٹھے ہو کر وجودی سفر کی علامت بناتے ہیں۔

6- گلی بطور داستانی زمان و مکان

وہ گلی ، وہ جانی پہچانی گلی
ہو گئی اک داستان، افسوس میں

.....

یہاں گلی ''داستان'' کا استعارہ ہے۔ یعنی گلی وہ جگہ ہے جہاں وقت داستانی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس میں ذاتی یاد بھی ہے اور اجتماعی قصہ بھی۔

تو ''گلی'' ایک استعارہ ہوا، زمان و مکاں کا، یہ وقت کا محفوظ رکھتی ہے (ماضی کی آہٹیں، یاد کا تسلسل، سناٹا)

یہ مکان کو معنویت دیتی ہے (محبوب کا محلہ، سماجی چرچے، اجنبیت کا خلا)۔ اور سب سے بڑھ کر یہ ذاتی وجود، اجتماعی فضا، اور وجودی فلسفہ کا کو اکٹھا کرنے والی علامت ہے۔ یوں ''گلی'' ان کے ہاں صرف ایک استعارہ نہیں بل کہ ایک تخلیقی زمان و مکان ہے جس میں زندگی کے مختلف پہلو اپنی اپنی کہانیاں سناتے ہیں۔

اپنی نظموں میں نوید صادق، 'گلی' سے نکل کر راستوں میں الجھ گئے ہیں، مگر 'گلی' کہاں پیچھا چھوڑتی ہے۔

(میں رستہ بھول جاؤں گا!)

میں اگلے چوک سے
دائیں مڑوں گا
اور بائیں سمت کی پہلی گلی
کے تیسرے در پر
ذرا سی دیر رک کر
لوٹ آؤں گا
گلی میں لوگ ہوں گے
میری جانب دیکھ کر، ہنس کر
کوئی فقرہ اُچھالیں گے
کوئی کھڑکی کھلے گی اور دروازہ
خموشی کی گرہ کو کھولتا.....!
لیکن ابھی تو چوک سے پہلے
بھی کتنے معرکے درپیش ہیں.....

مگر فی الحال ہم اپنی گفتگو کو ان کی غزل تک ہی محدود رکھتے ہیں۔

سو ہم کہہ سکتے ہیں ''گلی'' اردو شاعری میں ایک ایسا استعارہ بن گئی ہے جو کلاسیکی جمالیات سے لے کر جدید انسانی کرب تک ایک مسلسل سفر کی کہانی سناتی ہے۔

☆☆☆☆☆

کلیاتِ مکاتیبِ نذر صابریؒ (جلد اول و دوم) مرتبہ ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر: اجمالی جائزہ

خطوط نگاری اتنی ہی قدیم صنف ہے جتنی کی یہ کائنات۔ کیوں کہ ابتدائے آفرینش ہی سے اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ اور چنیدہ ہستیوں پر صحائف اور کتبِ آسمانی نازل کیں۔ ان صحائف اور کتبِ آسمانی کو لانے والے جلیل القدر فرشتے ''حضرت جبریلؑ'' نے گویا ایک پیامبر کا کردار ادا کیا۔ تب سے یہ سلسلہ ہائے پیام و پیغام، تحریری اور زبانی طور پر جاری و ساری ہے اور تا قیامت جاری و ساری رہے گا۔ اگرچہ! قدیم زمانے میں جہاں، پتھر کی سلوں اور کھالوں پر یہ تحریریں کندہ یا لکھی جاتی تھیں بعد میں ان تحریروں کو کاغذ پر لکھا جانے لگا۔ اسی لیے، خط کو عربی میں ''مکتوب'' کہا جاتا ہے۔

جدید دور میں اب خطوط نگاری تقریباً ناپید ہونے کو ہے کیوں کہ سماجی ذرائع ابلاغ (Social Media) نے خطوط کی وقعت کو کم کر دیا ہے۔ فی زمانہ، خط لکھنے کا رواج نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے، اب واٹس ایپ، موبائل، میسنجر، ای میل، وغیرہ پر سندیس بھیجے جاتے ہیں۔ جن کا انفرادی طور پر کوئی ریکارڈ (Record) بھی نہیں رکھا جاتا۔ لیکن، قدیم دور میں نہ صرف خطوط لکھے جاتے تھے بل کہ ان کا ریکارڈ بھی باقاعدہ رکھا جاتا تھا، یہی وجہ ہے کہ آج جب ہم ''خطوط نگاری'' کی تاریخ پر نظر دوڑاتے ہیں تو ہمیں پہلا خط جو دستیاب ہوتا ہے وہ ''حضرت سلیمانؑ'' کا خط ہے، جو ''ملکہ سبا'' کو لکھا گیا تھا، جس کا تذکرہ قرآنِ مجید میں کچھ یوں آیا ہے:

''سلیمان نے کہا، ہم اب دیکھتے ہیں تُو نے سچ کہا یا تُو جھوٹا ہے، لے جا میرا یہ خط اور ڈال دے اُن کی طرف، پھر اُن کے پاس سے ہٹ آ، پھر دیکھ، وہ کیا جواب دیتی ہے۔ کہنے لگی اے دربار والو! میرے پاس ڈالا گیا ایک خط عزت کا، وہ خط ہے سلیمان کی طرف سے، اور وہ یہ ہے۔ شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے کہ زور نہ کرو میرے

شوکت محمود شوکت

مقابلے میں اور چلے آؤ میرے سامنے حکم بردار ہو کر۔" (سورۃ النمل 31:26)

اس کے بعد، "تاریخ ابن عساکر" میں حضورؐ اکرم کی پیدائش مبارک سے تقریباً ہزار سال پہلے یمن کے ایک بادشاہ "حمیر بن وردع" جنھیں "تبع الحمیری" کہا جاتا ہے، کے بارے میں ایک واقعہ مرقوم ہے: کہ انھوں نے مدینہ میں آپؐ کے لیے ایک دو منزلہ گھر تعمیر کرایا تھا اور اس گھر میں ایک نگران مقرر کیا تھا کہ میں زندہ رہوں یا نہ رہوں یہ گھر حضورؐ اکرم کے حوالے کرنا ہے اور میرا خط بھی آپ تک پہنچانا ہے۔ یہ خط نسل در نسل ہوتا ہوا، حضورؐ اکرم تک "ابویعلی یا "ابولیلیٰ" کے ذریعے پہنچا، اس خط میں درج ذیل اشعار مرقوم تھے، جنھیں تاریخ کی باقاعدہ اولین نعت بھی کہا جا سکتا ہے۔ (یہاں ضمناً اس بات کا اضافہ کرنا ضروری ہے کہ یمن کی زبان میں "تبع" کے معنی بادشاہوں کے ہیں)۔ شاہ تبع کے نعتیہ اشعار ملاحظہ ہوں:

شھدت علی احمد انہ رسول
من اللہ باریٔ النسم
فلو مد عمری الی عمرہ
لکنت وزیرا لہ و ابن عم
وجاھدت بالسیف اعداہٗ
وفرجت عن صدرہ کل غم

....

ان دو خطوط کے علاوہ، قبل از مسیح بھی کچھ خطوط دستیاب ہوئے ہیں، جب کہ انیسویں صدی کے وسط میں عراق کے ایک شہر میں کھدائی کے دوران میں کچھ پتھر کی سلیں دریافت ہوئی ہیں جن پر سریانی زبان میں خطوط نما تحریریں کندہ ہیں۔ اس طرح، جب ہم عہد نبویؐ تک پہنچتے ہیں تو ہمیں حضورؐ اکرم کے خطوط مبارک سے نظر آشنائی ہوتی ہے۔ محدثین و محققین کے مطابق ان خطوط کی تعداد تین سو (300) کے قریب ہے، جن میں سے ایک سو انتالیس (139) خطوط مبارک ایسے ہیں، جن کا اصل متن محفوظ ہے اور چھیاسی (86) خطوط وہ ہیں جن کا صرف مفہوم کتب میں ذکر کیا گیا ہے۔ گزشتہ دو صدیوں میں نبیؐ کے چھے مکاتیب اپنی اصلی حالت میں دستیاب ہو چکے ہیں، یہ مکاتیب نجاشی شاہ حبشہ، منذر بن ساوی گورنر بحرین، قیصر روم ہرقل شاہ مصر و اسکندریہ مقوقس، شہنشاہ ایران خسرو پرویز کسریٰ اور شاہ عمان جیفر و عبدان کے نام ہیں۔ اب تو فارسی اور اردو زبان میں بھی مکتوب نگاری ایک صنف کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ یہاں تک کہ یہ سلسلہ ہائے خطوط غالب سے لے کر دور حاضر تک جا پہنچا ہے، موجودہ دور میں بھی مکتوبات مشاہیر پر مبنی

کتب منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو رہی ہیں۔ انھی مشاہیر میں سے ایک بڑا نام اُردو اور فارسی کے بے بدل شاعر، مکتوب نگار اور مخطوطہ شناس ''نذر صابریؒ (پ: 1923 - م 2013)'' کا بھی ہے جنھوں نے سیکڑوں خطوط معروف و مشہور شخصیات علم و ادب کے نام تحریر کیے ہیں، جن کی اب تک دو جلدیں بہ عنوان کلیاتِ مکاتیبِ نذر صابریؒ - جلد اول (مطبوعہ: مارچ 2022) اور کلیاتِ مکاتیب نذر صابریؒ- جلد دوم (مطبوعہ: جنوری 2025)، نظامیہ دارالاشاعت، مکھڈ شریف (اٹک) کے زیرِ اہتمام خوب صورتی کے ساتھ طباعت آشنا ہو چکی ہیں، جن کے مرتب اور تحشیہ نگار معروف شاعر، محقق اور ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد، ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر (پ: 9 اپریل، 1966) ہیں۔

ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر نے بڑی محنت، عقیدت اور عرق ریزی سے مذکورہ دونوں جلدیں وقیع مقدموں کے ساتھ نہ صرف ترتیب دی ہیں بل کہ ان مکاتیب میں استعمال ہونے والے اسمائے کتب و رجال، اماکن اور تراکیب و تلمیحات و حواشی و تعلیقات میں احسن طریقے سے بیان بھی کیا ہے۔ کلیاتِ مکاتیب نذر صابریؒ (جلد اول) میں کل ایک سو دس (110) خطوط شامل ہیں جو کہ نذر صابریؒ نے معروف محقق اور ماہرِ مخطوطہ شناس ڈاکٹر عارف نوشاہی کے نام لکھے ہیں۔ کلیاتِ ہذا کا پیش لفظ ڈاکٹر عارف نوشاہی نے ''نذر صابریؒ (مرحوم) سے میرے چہل سالہ تعلقات اور مراسلت'' کے عنوان سے خود تحریر کیا ہے جو خاصا معلومات افزا ہے۔ جب کہ ڈاکٹر نوشاہی نے نذر صابریؒ کے ان خطوط اور ادوار بھی متعین کیے ہیں، آپ (ڈاکٹر عارف نوشاہی) کے نام صابریؒ کے پہلے خط پر 12 اکتوبر، 1975 کی تاریخ درج ہے جب کہ آخری خط پر مارچ 2012 تحریر ہے۔ اس کلیات میں ان خطوط کے علاوہ، ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر نے کتاب کے آخر میں نذر صابریؒ کے حوالے سے ایک مرثیہ (آزاد نظم کی صورت میں) بہ عنوان ''نوحہ'' بھی تحریر کیا ہے - اس مرثیے میں سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''جس گھڑی بزمِ عالم سے وہ اُٹھ چلا
بامِ خاور پہ اک نروسا چھا گیا
اس کی رحلت کا سن کے ہوا سر پٹکنے لگی
آسماں رو پڑا
اور زمیں بین کرنے لگی
وہ قلندر تھا
یا پھر وہ درویش تھا

یا کرامت تھا وہ شاہ مدارس کی
جو مدینے کی خوشبو میں گوندھی گئی''

جہاں تک، کلیاتِ مکاتیب نذر صابریؒ (جلد دوم) کا تعلق ہے، اس کلیات میں تین علمی و ادبی شخصیات ''خواجہ محمد خان اسد حضروی''، مولانا صالح محمد خان'' ''اور راشد علی زئی'' کے نام، نذر صابریؒ کے کل چورانوے (94) خطوط شامل ہیں۔ خواجہ محمد خان اسد حضروی نہ صرف ایک علمی و ادبی شخصیت تھے بل کہ حضرو شہر (اٹک) میں آپ نے ایک بڑی لائبریری 'اپنے استادِ گرامی سید سلیمان ندوی کے حکم پر 1932 میں قائم کی تھی، جس کا نام معروف ومشہور محقق اور شارحِ دیوانِ غالب 'غلام رسول مہر'' نے ''میرا کتب خانہ'' تجویز کیا تھا۔ جب کہ مولانا صالح محمد خان اور راشد علی زئی بھی علمی اور ادبی شخصیات میں شمار ہوتی ہیں، یہ دونوں اصحاب پسرانِ خواجہ محمد خان اسد حضروی ہیں۔ اسی لیے، کلیاتِ مکاتیبِ نذر صابریؒ (جلد دوم) کے سرورق پر یہ تحریر بھی درج ہے'' مکاتیب بنام خواجہ محمد خان اسد حضروی و فرزندانِ او''۔ یہاں اس بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ مکتوب نگاری نذر صابریؒ کے خواجہ محمد خان اسد حضروی کے ساتھ نہ صرف دیرینہ مراسم تھے بل کہ دونوں شخصیات نے مختلف علاقہ جات کے علمی اسفار بھی اکٹھے کیے تھے۔

بہرحال، کلیاتِ مکاتیب نذر صابریؒ (جلد دوم) میں خواجہ محمد خان اسد حضروی کا اجمالی تعارف اور آپ کے نام نذر صابریؒ کے تیس (30) خطوط مع متن و حواشی درج ہیں جب کہ مذکورہ خطوط کے ادوار بھی متعین کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد، خواجہ محمد خان اسد حضروی کے بڑے بیٹے ''مولانا صالح محمد خان'' کا اجمالی تعارف اور آپ کے نام نذر صابریؒ کے نو (9) خطوط مع متن وحواشی، کلیاتِ ہذا میں شامل ہیں اور اسی طرح، آخر میں خواجہ محمد خان اسد حضروی کے فرزندِ خرد ''راشد علی زئی'' کے نام نذر صابریؒ کے پچپن (55) خطوط مع متن و حواشی بھی کلیاتِ ہذا کا حصہ ہیں۔

القصہ، مذکورہ دونوں کلیاتِ مکاتیبِ نذر صابریؒ مرتبہ، ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر اپنے اندر علم و ادب کے بے بہاء، دُر سموئے ہوئے ہیں، جن کے مطالعے سے نہ صرف ان معتبر مکتوب الیہم کے علم وادب کے لیے گراں قدر خدمات کا پتہ چلتا ہے بل کہ مکتوب نگار (نذر صابریؒ) کی وسعتِ مطالعہ اور علمی و ادبی ابحاث سے بھی آشنائی ہوتی ہے۔

☆☆☆☆☆

پرانی دوست سے ملاقات

یوں تو پرانے دوست کہیں بھی نہیں جاتے ہمیشہ یادداشت کے کسی صفحے پر اپنی اُسی آب و تاب کے ساتھ براجمان ہوتے ہیں۔ وقت اور عمر کے گزرنے یا بڑھ جانے سے دوستی کی شاخ پر گل نمو پانے سے باز نہیں آتے ۔ موسم اور رُتیں خواہ دستک دیئے بغیر گزر جائیں مگر بہار خزاں کی مہک اپنا سراپا دکھا کر ہی جاتی ہے۔

لمحہ موجود کے اس دور میں کہ جہاں گزشتہ ابواب کھولنے اور دیرینہ بخیے اُدھیڑنے سے اُس ہو جاتا ہے، ماضی کو حال میں جوڑ کر سے کی رسّی میں پروتے رہنے کا مشغلہ کچھ ایسا بُرا بھی نہیں ہے۔ پرانی کتابوں کی خوشبو کی طرح دوستوں کی دوستی بھی دلربانی سے بھرپور ہوتی ہے۔

گزشتہ برس 2025 اپنی تخلیق کردہ تا حال کی تمام کتب کو یک جلد کرنے کا دھیان آیا تو اپنی شاعری جو آج تک صفحہ قرطاس پر بکھری اُسے از سرِ نو پڑھا۔ اُس میں اپنے تجربے اور مزید نکھار کی بنیاد پر کہیں کہیں اضافے کیے اور اپنی ہی بھولی پڑی نظموں، غزلوں کو اپنی دسترس میں کرتے ہوئے (دیپک) کلیات کی جلد کا اہتمام کیا۔

اپنی تمام کتب کی تقاریب برپا کرنے کی خواہش کے تحت لاہور الحمرا ہال نمبر 2 میں 9 ستمبر 2025 کو دیپک کی رونمائی منعقد ہوئی۔ اس تقریب کے لیے چونکہ میں نے اپنی بساط سے بڑھ کر ہال کا فیصلہ کر لیا تھا کہ یعنی اسے الحمرا کی ادبی بیٹھک یا ہال 3 میں منعقد نہیں کیا تھا حالانکہ صاف دکھائی دیتا تھا اور مجھے امید بھی کم تھی کہ تمام کرسیاں بھر سکیں گی کیونکہ اتنے احباب اور دوست تو میرے ہیں بھی نہیں۔ یہ اعتماد بھی نہیں تھا کہ مرے بلانے پر اس مصروف دور میں سب آ بھی جائیں گے۔ مگر ہوتا یوں ہے کہ جب میں کتاب تقریب منعقد کرنے کا فیصلہ کر لوں تو پھر میں اسے دل و جان کی کوشش سے اور ایڑی چوٹی کا زور لگا کر کامیابی بنانے کی تگ و دو کرتی ہوں۔ ٹیلی فون،

رخشندہ نوید

پیغامات، میلز کے ساتھ ہر ایک آدھ دن چھوڑ کر یاد دہانیاں، دعوت نامے کے کے کارڈ اور سلام دعا کے پیغام بھیجنا میرے لیے لازم ہو جاتا ہے - ''دیپک'' کی تقریب تک مجھے ایک خاص قسم کی بے چینی رہی- جیسے جیسے میرے دوستوں اور احباب کی شمولیت پر ٹِک مارک لگتے گئے اس بے قراری کو آرام آتا رہا- لیکن دل موج بے تاب کی تہوں میں آخری دن تک ایک پیرکون ہلکے درجے کا طوفان ہلچل جاری رہا-

میں نے دعوت نامہ جو بہت محنت سے میں نے ماہنامہ بیاض کے آرٹسٹ سے بنوایا تھا اور جس کے لیے نہایت محترم عمران منظور صاحب نے اپنے دفتر کے دروازے مجھ پر کھول دیئے- گو میں ایک ہی بار اُن کے دفتر اپنی کلیات ''دیپک'' تحفہ کرنے گئی لیکن ساتھ ساتھ کتنی ہی فرمائشیں بھی دفتر کے میز پر دھر دی تھیں-

''بیاض'' کے چھتر چھایا جو ہمیشہ سے مجھ پر سایہ فگن رہا بہت عمدہ کارڈ ڈیزائن ہوا، کارڈ کی ڈیزائننگ، الحمرا میں لگائے جانے والے بڑے بڑے بینرز بیاض کا ہی تحفہ تھے- اس تقریب کو یادگار بنانے کے لیے جہاں میں نے اور بہت سے اہتمام کیے وہاں میں نے اپنی فرینڈز لسٹ کو ازسرِ نو کھنگالا - اور پرانے رابطوں ، واقفوں، دوستوں سب کو تلاش کیا- فیس بک سے، اپنے واٹس ایپ کروپس سے اور پھر کچھ احباب کے کارڈ جو میرے پاس محفوظ تھے- ان سے رابطہ کے نمبرز تلاش کیے-

انھیں میں ایک نام صائمہ اسماء تھا کہ جس سے شاید میری اول ملاقات کسی مشاعرے میں بیس برس قبل ہوئی تھی- نہایت پاکیزہ اور اعلیٰ شخصیت نے مجھے ان سے دوستی بنائے رکھنے پر اسی روز آمادہ کر لیا تھا- وہ بھی کنبہ بیاض سے جڑی تھیں اور ان پر ایک خاص گوشہ بھی خالد صاحب نے ''بیاض'' کے خاص نمبر میں چھاپا تھا- انھیں دنوں ان کی اول شاعری کی بہت اعلیٰ کتاب (گل دوپہر) کے نام سے شائع ہوئی تھی- اس سے دوستی کا ایک حوالہ رسالہ بتول تھا بتول رسالہ اخلاقی، مذہبی، اور فلاحی اقدار کا پروردہ وہ مستقل 50 برس سے چھپنے والا رسالہ ہے جس میں حیات کا مقصد ایک بہترین اور دینی طریقے سے زندگی گزارنا بتایا جاتا ہے-

اس رسالے کا مجھ تک پہنچنا کیسے ہوا؟ کچھ ٹھیک سے یاد نہیں بہرحال ہمارے صاحب نوید کے ایک دوست ڈاکٹر منصور کہ جو ہمیشہ بہت اجلے لباس اور صاف ستھری شخصیت کے مالک دکھائی دیتے ہیں، اور وہ ایک اعلیٰ لکھاری بھی ہیں (افلاطون) ان کی ایک کتاب کا نام ہے- اس کے سوا بھی وہ علم وفضیلت کی حامل شخصیت ہیں، جن کے گھر ہمارا آنا جانا رہتا تھا اور آج بھی یہ سلسلہ

جاری ہے، جنکی شریکِ حیات بھی مکمل پردہ دار اور دین دار بہت پڑھی لکھی، شائستہ خاتون، جن سے مری ملاقاتیں رہی۔ ڈاکٹر منصور کی بھابی مسز آسیہ راشد رسالہ بتول سے وابستہ تھیں - اسی زمانے میں کچھ مشاعرے اور تقاریب بھی بتول کے بینر تلے منعقد ہوئیں۔ جہاں ڈاکٹر منصور کی بھابی مسز راشد سے اور صائمہ اسما سے ملاقاتیں رہیں - یوں بتول مجھ تک آنا شروع ہوا اور میں نے بھی اپنی تخلیقات بتول کے لیے روانہ کرنے کا آغاز کیا۔

بتول اور بتول کی ایڈیٹر صائمہ اسما سے قرابت داری کا سلسلہ بہت برس جاری رہا لیکن پھر معلوم نہیں کیوں اور کیسے منقطع ہو گیا۔ یقیناً اس میں میری سستی، کاہلی یا کہیں کھو جانے کا دورانیہ ہوگا۔

صائمہ اسماء ادارہ بتول کی مدیرہ، نہایت خوبصورت اور دلپزیر شخصیت کی مالک، برسوں پہلے جوان کا سراپا مرے ذہن میں منقش تھا وہ کسی فرشتہ صفت ہستی کا تھا۔ خود کو ڈھانپ بنا کر رکھنے والی یہ مدیرہ جن سے مرا رابطہ کٹ چکا تھا، سوا ان پچھلے کئی برسوں میں کبھی بھی ان کے بارے میں مجھے فیس بک سے کچھ آگاہی ہو جاتی تھی۔ ہمیں ایک دوسرے کی خبر نہ تھی۔ جب میں نے اس برسوں پرانی دوست کو اپنے واٹس ایپ نمبروں سے تلاش کیا اور ''دیپک'' کی تقریب پر آنے کی برقی دعوت ارسال کی۔ دیکھیں مجھے اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ میں فون پر بات ہی کرتی اور کم از کم خود دعوت دیتی۔ بس اپنی مصروفیت کا دل ہی دل میں بہانہ بنا کر فقط ایک دعوتی پیغام لکھ دیا تھا۔

دیپک کی تقریب پر تقریباً سب سے پہلے آنے والوں میں صائمہ اسماء تھی جن کو دیکھ کر میری خوشی کا اندازہ لگانا ممکن نہیں صائمہ کا وہی خوبصورت حسین چہرہ دیکھ کر مجھے خود پہ شرمندگی ہوئی کہ اتنے برس میں نے اس سے رابطہ نہیں کیا یقیناً میری کوتاہی اور مزاج کی خرابی اور کہیں ڈوب کر غائب ہو جانے والی عادت ہی مورد الزام ہے۔

ہر انسان میں کچھ اچھی اور کچھ بری عادات، مزاج کی روش کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ دیکھا جائے تو میں دوستوں سے بہت محبت، خلوص، پیار، ہمدردی کا جذبہ تہہ در تہہ اپنے دل میں محسوس کرتی ہوں لیکن ایک عجب سی خرابی مجھ میں بدرجہ اتم موجود ہے کہ میں بہت اچھے دوستوں سے رابطے کھو دیتی ہوں۔ سوچتی رہتی ہوں کہ اس سے یا اُس سے رابطہ کرنا ہے انھیں یاد بھی کرتی ہوں لیکن کچھ سماں گزر جانے کے بعد ویسے ہی ایک جھجھک سی جنم لے لیتی ہے اور یوں اسی طرح برسوں مہینوں کے گزرتے کچھ دیر نہیں لگتی - میں نے خود کو بہت بار ملامت کی، کوسا کہ مجھے اپنے خول سے باہر رہنا ہوگا۔ شاید میں اُس دورانیے میں کسی، ڈیپریشن میں چلی جاتی ہوں کہیں کھو جاتی ہوں،

جس کے نتیجے میں مرا بہت نقصان ہو جاتا ہے۔ میں دوستوں سے کٹ جاتی ہوں۔ دور ہو جاتی ہوں۔ ایک نظم ثبوت کے لیے یہاں لکھ رہی ہوں جو مری حالت بیان کر سکے۔

تُو کہیں نہیں تھی (نظم)

اتنے دنوں تک کہاں رہی
تو کہیں نہیں تھی
میں نے کس کس جا ڈھونڈا ہے
صبح سویرے اوس کی جھلمل بُوند کے بھیتر
روزنِ شب کی تاریکی میں
چاند ستاروں کے گرداب میں گھوم کے دیکھا
والانوں کے پچھلی جانب کھلتے رستے
جن سے ہوا بھی ناواقف تھی
میں نے کس کس جا ڈھونڈا ہے
لیکن تُو تو کہیں نہیں تھی
تکیوں کی نرمی میں ٹٹولا
نیندوں کے دروازے کھولے
خوابوں کی کھڑکی میں جھانکا
تیرے دل کی دھڑکن پر بھی کان لگائے
ہنسی کی بارش
اشکوں کے صحرا کے پار تلاشا تجھ کو
کونے کھدروں درزوں میں بھی نظر نہ آئی
اونچے پیڑوں
گھر کی چھت پر کھڑے کھڑے آواز لگائی
نوک قلم کے کالے آنسو
کاغذ کفن کو کھول کے دیکھا
آڑی ترچھی سطریں ناپیں
لیکن تُو تو کہیں نہیں تھی
ماہ و سال میں کتنے ہی دن
جانے کہاں تُو کھو جاتی ہے
جانے کیا ہوتا ہے تجھ کو جب تو ایسی ہو جاتی ہے
جیون کے اوراق سے کیا میں
ان پنوں کو
خارج کر دوں؟

صائمہ اسماء سے ملاقات سے ثابت ہو گیا کہ پرانے دوست، سچے رابطے بھلے دس بیس برس بعد بھی سامنے آ جائیں تو محبت کا جل تھل کرتا سمندر پھر سے امڈ آتا ہے۔

صائمہ کا لایا ہوا تحفہ میں نے کسی کو پکڑایا اور پھر میں دوسرے مہمانوں سے ملنے میں محو ہو گئی۔ لیکن صائمہ اسماء کا میرے حال چال پوچھنے پر کہا ہوا جملہ کہیں میرے شعور میں ٹھہر گیا۔ (پچھلے برس کچھ اپ سٹ رہی"۔ ملنے پر بتاؤں گی۔) صائمہ کی آنکھوں اور الفاظ نے بتایا کہ زندگی میں کچھ تبدیلی آئی ہے۔

صائمہ "دیپک" کی رونمائی، جو کہ مقررہ وقت سے آگے تک چلتی گئی تھی، ختم ہونے سے قبل ہی واپس چلی گئی تھی۔

دیپک کی تقریب کے بعد ایک گونہ گوں سرشاری، جو دوستوں کی آمد سے تشکیل پائی، مجھ پر بہت دن طاری رہی۔ ان دو ماہ میں بہت بار دھیان آیا کہ صائمہ اسما نے کہا تھا کہ زندگی میں کچھ ایسا ویسا ہو گیا ہے۔ مری طبیعت کو بے چینی سی تھی۔ اور صائمہ سے ملاقات کی شدید خواہش تھی۔

اس کا گھر بہت دور ہے یہی سوچ کر بار بار

پروگرام بنتا بگڑتا رہا، لیکن آخرکار میں نے دل کی سنی۔ اور اُس کے گھر وقتِ مقررہ پر پہنچی۔

ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کے بعد صائمہ اسماء ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو بار اوّل میں نے اُس کا پورے کا پورا سراپا دیکھا وہ اپنے پردہ کرنے کی سعادت اور دینی روایت کے تحت ہمیشہ کم کم عیاں دکھائی دیں۔ بہت برسوں پہلے والی صائمہ اسما بھی وہی تھی اور ''دیپک'' کی تقریب پر بھی وہ خود کو نفاست سے لپیٹے ہوئی تھی۔

آج اسے دیکھا تو ماشاء اللہ پڑھا۔ وہ بہت اعلیٰ لباس میں اپنے مکمل سراپا اور خوب صورتی کے ساتھ اپنے انتہائی خوبصورت آرائش سے مزین ڈرائنگ روم میں میرے سامنے تھی۔

صائمہ سے باتوں کا آغاز ہوا، بچوں، گھر، فیملی ایک دوسرے کی مصروفیت۔ صائمہ کی پی ایچ ڈی میں لکھے گئے مقالہ جات اور اس کی تعلیمی منازل طے کرنے کی آگاہی نے بہت متاثر کیا۔

اس کا گھر ذوق اور سلیقے سے سجا سجایا گھر، جو اس نے اپنے شوہر کے ساتھ مل کر خود ارمان سے تعمیر کرایا۔ چائے کی ٹرالی پر صائمہ اسما کے اپنے گھر کے اور اپنے ہاتھوں سے بنے کیک اور دوسری چیزیں کھانے میں مگن ہوئی تو میں نے پوچھا کہ بھائی کا کیا شغل ہے؟ میرا مطلب ہے وہ کس شعبہ میں ہیں۔ کیا کاروبار کرتے ہیں؟ تو صائمہ نے مجھے تفصیلاً بتانا شروع کیا، جو صائمہ نے بتایا اس سے مجھے معلوم ہوا کہ صائمہ کے ہمسفر کس قدر انتھک کام کرنے والے دلچسپ انسان ہیں، وہ بڑی بڑی کمپنیز کے چلانے والوں کو ہمت، محنت اور طریقے سے اپنے پراجیکٹ کو چلانے کے گُر فراہم کرتے ہیں یہی ان کی جاب ہے۔ وہ کمپنیز کے مالکان اور اُن میں کام کرنے والوں کو ان کے شہر سے دور دراز پہاڑی مقامات پر لے جاتے ہیں اور پھر انھیں موسی سختیوں سے نمٹنے کا تجربہ دیتے ہیں۔ بھوک لگ جانے پر کھانے کے انتظار کی بے قراری، برداشت کرنے کا موقع دیتے ہیں۔ پُرفضا بلند مقامات میں کس طرح مشکل زندگی گزاری جاتی ہے۔ پہاڑوں پر کیسے چڑھا جاتا ہے کسی مہم جو کی طرح زندگی سے کیسے نبرد آزما ہو کر حصہ لیتے ہیں، وقت کی پابندی کیسے عادت بنائی جاتی ہے۔ اور زندگی کی مشکلات کا ذائقہ کیسا ہوتا ہے۔ یہ تمام تجربے کروانے کے لیے وہ ان ہائی فائی افراد کی ٹریننگ خود ٹرینرز کے طور پر اپنی خدمات پیش کرتے ہیں۔ اس تربیتی کورس سے جہاں پانچ چھ دن میں بڑے سے بڑے پراجیکٹ کو درست طریقے سے قوت برداشت کے ساتھ وقت پہ نبھانے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ وہاں سیر و تفریح اور کیمپ لائف کا تجربہ بھی سردی گرمی میں بہت کچھ سکھا دیتی ہے۔

یہی ان کا کاروبار ہے۔ میں جو ہمیشہ سے مختلف لوگوں، ان کے مشاغل ان عادات کا

مشاہدہ کرنے کی عادی ہوں یہ سب سن سُن کر سرشار ہو رہی تھی کہ کتنا دلچسپ کاروبار ہے۔ یہ کیسی مزے کی نوکری ہے یا پیشہ ہے کہ ٹیم کو تجربے کی راہ دکھانا، انھیں مشکلات کی بھٹی سے گزار کر کندن بنانے کا ہنر سکھانا۔ صائمہ نے بتایا کہ وہ بھی اکثر شوہر کے ہمراہ ان ٹورز پر جاتی ہیں اور ان کا حوصلہ بڑھاتی ہیں۔ صائمہ کی باتیں سن سن کر میں حیران تھی کیسے کیسے نئے نئے کاروبار اور جاب دقوع پزیر ہو چکی ہیں۔

میں ساتھ ساتھ صائمہ کی بنائی گئی دہی پھلکیوں کا مزہ لے رہی تھی اور چائے کا لطف اٹھا رہی تھی وہ اپنے شوہر کی تمام باتیں اُن کی ہمت اور ان کی زندہ دلی کی داستانیں سنانے کے بعد ایک دم صائمہ نے کہا (کہ میرے شوہر پچھلے برس نہیں رہے) ۔دیکھیں میں ''آپ کو کیسے ان کی باتیں سنا رہی ہوں'' وہ بس آناً فاناً چلے گئے۔

اور کپ میرے ہاتھ میں لرز کر رہ گیا۔ میں نے چائے کا کپ میز پر دھرا، اور کیا..... کیا؟ میرے لب بڑبڑا کر رہ گئے۔

اس کے بعد صائمہ نے مجھے ان کے چلے جانے کا جو واقعہ سنایا وہ بھی مجھے حیرت میں مبتلا کرتا چلا گیا۔ ابھی ہم ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے یکدم مجھے اس اندوہناک خبر نے صائمہ کے ساتھ ساتھ شدید دکھ سے بھر دیا۔ اسی دوران صائمہ کی بہو داخل ہوئیں ہم دونوں کو اس حالتِ افسوس میں دیکھ کر صائمہ نے بتایا کہ رخشندہ کو نہیں معلوم تھا تمھارے انکل کی وفات کا۔ بس پھر کیا تھا میں اُس ٹرالی پر رکھ صائمہ کے ہاتھوں کے بنے کیک کھانا بھول گئی۔ بس مجھے تو اتنا ہی یاد رہا کہ زندگی کیسے کیسے پیارے لوگوں کو کتنا بڑا بڑا دُکھ اور صدمہ دے دیتی ہے۔

ان کی وفات سے قبل، یہ ہپی کپل ایک ماہ کی غیر ملکی سیاحت پر تھا۔ صائمہ مجھے تصویریں دکھا رہی تھی کہ وہ دونوں کیسے اس ٹرپ پر خوش اور نشاط آگیں لمحات گزار کر آئے اور غیر ملکیوں کی ٹیم ٹریننگ کے لیے بک کر کے آئے لیکن وہاں پر معمولی پاؤں کی تکلیف اور پھر لاہور میں اس پاؤں کے سن ہونے کا علاج کرنے کے لیے ڈاکٹر کی غلط دوا کے ری ایکشن نے ان کی زندگی کو موت کے غار میں دھکیل دیا اور بس ایک ماہ میں زیست الٹ پلٹ ہو کر رہ گئی۔ اور ہنستا بستا گھرانہ کیسے خاموش ہو چکا ہے۔

صائمہ کے دونوں ہاتھوں کو واپسی پر تھامے ہوئے اسے تسلی دیتے ہوئے میں نے وعدہ کیا کہ ہم رابطے میں رہیں گے۔ میں بتول کے لیے کچھ نہ کچھ لکھا بھی کروں گی۔

نہیں معلوم تھا صائمہ کی آنکھوں میں ''دیپک'' کی رونمائی کے روز جو دکھ سا دکھائی دیا تھا۔ وہ اتنا بڑا دکھ ہوگا۔ ''زندگی بھر کا دکھ'' خدا تعالیٰ اُسے ہمت دے، حوصلہ دے آمین۔

☆☆☆☆☆

کیفیات واحساسات کی شعوری شاعرہ.....ڈاکٹر خالدہ انور

وہ شعوری سطح پر دھیان سے چلنے والی طبع کی مالک ہے..... اسے اپنی ذات میں ایک بے چینی ایک کسک کی چبھن مسلسل جاں کو مٹھی میں لیے روز و شب گزارتی چلی آ رہی تھی.....ایسے میں وہ آسماں کی سحابی پرتوں سے اپنی سوچ کے آنچل بنانے لگی..... یہ لمحہ اس کی شعوری تخلیقی جوت پر کُن کا مظہر ٹھہرا.....اس نے اپنے ہونے کے احساس کو آئینے میں دیکھا تو اس کی ذات کے شبنمی قوس رنگوں نے اپنے قرطاس پر خیال کی روشنی کو حروف کی خلعت زیب تن کی.....وہ سچ کہتی ہے: کہاں گمان میں تھا''

کیا خوب غالب نے کہا تھا:

زندگی اپنی جب اِس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

.....

ڈاکٹر خالدہ انور کا پہلا شعری مجموعہ ''کہاں گمان میں تھا'' جو احساس دلاتا ہے کہ شاعرہ کے ہاں اپنی سوچ کا مدار.....اور اپنا خیال و فکر ہے، جسے بڑی ہنرسازی سے کتابی شکل دی گئی۔ اس میں زبان و بیان کا فطرتی سہل اسلوب رواں دواں دکھائی دیتا ہے۔ شعری بساط پر مؤثر انداز سے خیال آفرینی کی جھلک جا بجا نظر آتی ہے۔ جیسے کے مقدمہ شعروشاعری میں حالی نے قافیے کے حوالے سے کہا ہے کہ ''قافیہ بھی وزن کی طرح شعر کے حسن کو بڑھا دیتا ہے، جس سے اس کا سننا کانوں کو نہایت خوشگوار معلوم ہوتا ہے اور اس کے پڑھنے سے زبان زیادہ

پروین سجل

لذت پاتی ہے۔'' لہٰذا اس شعری کائنات ''کہاں گمان میں تھا'' میں گا ہے بگا ہے قافیہ ردیف کی برجستگی اور نغمگی بھی خوب ہے، جیسے کہ یہ اشعار بحرِ ہزج، فاعلت مفاعیلن فاعلن مفاعیلن میں دیکھیے:

تم نہ اس محبت کو کوئی معنی پہناؤ
بس جوازِ اُلفت کو مخمصے میں رہنے دو

کچھ بھرم تو رہنے دو سابقہ تعلق کا
اپنے نام کو میرے لاحقے میں رہنے دو

.....

کسی بھی تخلیق میں اس کا آہنگ وصوت اور تخیل اہم حوالہ ہوتا ہے کیوں کہ متخلیہ کی پرواز ہی سے معیارات کے اسباب پیدا ہوتے ہیں۔ ودیعت کے ساتھ مطالعہ کی اہمیت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ اس سے تخلیقی فن پارہ کی قوت کا بیانیہ پورے اظہار کے ساتھ سربلند ہوتا ہے۔ کولرج نے کہا:

''شاعری کا سارا جادو اس کا تمام حسن اس کی تمام قوت اس فلسفیانہ اصول میں ہے، جسے ہم طریقہ کار کہتے ہیں'' اس بات سے یہ مطلب بھی اخذ ہوتا ہے کہ شاعری کے وزن، تخیل اور الفاظ کے چناؤ کا عمل فلسفیانہ اصول ہیں۔''

ایک اور اہم نکتہ کولرج نے کہا کہ:

''نثر میں الفاظ بہترین پیش کیے جاتے ہیں، اور شاعری میں الفاظ بہترین ترتیب سے پیش کیے جاتے ہیں''

لہٰذا شاعرہ نے ..... صرف فنی سطح کو ہی ملحوظ خاطر نہیں رکھا بل کہ اپنے خیال کو جو آنچ دی اس سے، اُن کی شاعری میں کیفیات اپنی اشکال لیے دھڑکتی ہیں۔ جب کہ عموماً ایسے میں عروض کو ٹیک دیتے دیتے فکری روانکل کا شکار ہو جاتی ہے، لیکن اس نے رواں بحور میں مشکل قافیہ کو کئی جگہوں پر مہارت سے نبھایا۔ یہی نکتہ ''کہاں گمان میں تھا'' کی شاعری کا حوالہ بنتا ہے، ان اشعار کے بھی قافیے بحرِ رمل فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن میں دیکھیے:

یہ کتابِ زندگی ہے اور ہے کتنی ادق
ہو نہ پایا یاد اس کا عمر بھر پہلا سبق

جانے کیوں اور کس طرح اُن سے محبت ہو گئی
یہ محبت بھی ہے اک بارِ الم ربِّ الفلق

درد کا صحرا نہ ہم سے ہو سکا اب تک عبور
عشق نا ہنجار نے روشن کیے چودہ طبق

.....

اسی طرح ان اشعار میں مشکل قافیے کی تکرار ہی ردیف نہ ہونے کے باوجود احساس کو لحن دیتی ہے۔ تو ایک مترنم ماحول کی خوش آویزی بحرِ متدارک فاعلن فاعلن

فاعلن فاعلن میں بھلی لگتی ہے، جیسے کہ:

زہر اس زیست کا پھانکتے پھانکتے
پالیا ہے ہدف ہانپتے ہانپتے

اے خدا بچ گئی تھی مرے واسطے
صرف شوریدگی بانٹتے بانٹتے

پاؤں کھلتے ہیں گر سر کو پورا کریں
تھک گئے زیست کو ڈھانکتے ڈھانکتے

.....

خالدہ انور نے ہم عصر شاعرات میں کلاسیکی روایت کے ساتھ اپنے ہونے کا احساس دلایا ہے۔ ان کی شعری دنیا میں نئے جہان کے امکان کی طرف تو نہیں لے جاتیں۔ نہ ہی ایسی کوئی خیال افروزی جو نئے معنی کے پرچم ہوا کرے۔ بس، اُن کی ذات اکناف واطراف کو کشا کرتے ہوئے۔ اپنے اظہار کی جگہ ضرور بناتی ہے۔ یہ جگہ بنا جانا ہی پہلا زینہ ہے۔ اسی سے پھر اگلی مسافتوں کے نقوش مہمیز ہوتے ہیں۔

شاعرہ کے ہاں شعری جمالیات کا تخیل اس کے ادراک وفہم کو نمایاں کرتا ہے۔ اس کے ہاں مستعار خیال کی آمیزش خال خال ہے اور نہ ہی توارد کی مد میں اپنی قامت کو بڑھانے کی سعی کی گئی ہے۔ وہ اپنی جاں فشانی کے تیشۂ فرہاد سے کوہ کنی کرتے ہوئے جوئے شیر لاتی ہیں اور اس کا یہ سفرِ سخن ظاہر وباطن کے مدوجذر کی خروشاں لہروں کو پیچھے دھکیلتے ہوئے آہستگی سے آگے بڑھتا ہے، کیوں کہ اس کے ہاں جوشِ مضامین کا فشارِ انقلاب نہیں ہے۔ ایسے میں صرف اپنی حیات کے جور کی خاصیت اور صلاحیت نمایاں کرنا مقصود ہے۔ لہٰذا آج۔ شاعرہ جو بھی وہ ہی اس کی اصل پہچان ہے۔ مولانا رومیؒ کی ایک حکایت ''سایہ حقیقت کب ہے؟'' کا مقصود اس ضمن میں یوں ہے کہ:

''آپؒ بیان کرتے ہیں کہ حقیقت کو پہچانو اور سراب کے پیچھے نہ بھاگو، کہ سراب کے پیچھے بھاگنے والے کی مثال اس احمق کی سی ہے، جو سورج کی روشنی کو ہی سب کچھ سمجھ لیتا ہے اور جس نے سورج کو اس مقام پر فائز کیا اس کو سمجھنے سے قاصر ہے''

خالدہ انور نے جو بھی نوکِ مژہ سے لکھا۔ اپنی ذات کی کھٹیالی سے کشید کیا۔ اس نے اپنی کیفیات اور احساسات کو شعوری پہچان دی۔ یہی اس کی کامیابی کی علامت ہے۔

شاعرہ کے اس شعر بحرِ خفیف، فاعلاتن مفاعلن فعلن کے ساتھ اجازت:

آج ہم جو کسی بھی قابل ہیں
اس میں ماں کی دعائیں شامل ہیں

☆☆☆☆☆

دُکھیارے سے ہیچ تک ..... انیس اشفاق

انیس اشفاق کا ناول نگاری کا فن ماضی پرستی، قدامت پسندی اور لکھنؤ تہذیب کی عکاسی کا نمائندہ ہے انیس اشفاق افسانہ نگار شاعر اور نقاد ہیں چار ناولوں کے مصنف ہیں پیشے کے لحاظ سے استاد ہیں شعبہ تعلیم سے وابستہ رہ چکے ہیں انیس اشفاق نے 2014 میں دکھیارے ناول لکھا جسے ادبی حلقوں میں بے حد پذیرائی ملی اس ناول پر اخبار ڈان میں انتظار حسین نے تبصرہ نما مضمون بھی لکھا- یہ ناول سوانحی رنگ لیے ہوئے ہے اس کی اہم کرداروں میں بڑے بھیا، ماں، منجھلے بھیا خود مصنف، سائرہ شمامہ، نواب آغا، حکیم وغیرہ شامل ہیں- بڑے بھیا بچپن سے دماغی خلل میں مبتلا ہیں مزاجاً متلون مزاج ہیں- ٹک کر کام نہیں کر سکتے پھر ماں کی وفات کے بعد گھر سے چلے جاتے ہیں اور یہاں وہاں بھٹکتے رہتے ہیں- مصنف نے امام باڑوں اور پرانی حویلیوں کو بھی شاملِ ناول کیا ہے- لکھنؤ کی مٹتی ہوئی تہذیب اور نوابوں کی جاتی ہوئی جاہ وحشمت جیسے عناصر کو ملا کر ناول کی بُنت تیار کی گئی ہے- بڑے بھائی امام باڑوں کی صحنچیوں میں رہنے لگتے ہیں- بیمار ہو جاتے ہیں اور ایک دن وفات ہو جاتے ہیں یہی پر ناول کا اختتام ہو جاتا ہے- ناول کی فضا اداسی کا گہرا تاثر لیے ہوئے ہے یہ اداسی افراد کے اندر بھی ہے اور مجموعی معاشرتی فضا میں بھی - ناول کے کردار معاشرے میں رہنے والے عام افراد ہیں- جو مختلف مسائل و مصائب کا شکار ہیں- جزیات نگاری میں انیس اشفاق صاحب کو کمال حاصل ہے- انیس اشفاق کا دوسرا ناول خواب سراب ہے "جس میں للیش بیک کی تیکنیک استعمال کر کے تکنیکی تجربہ کیا گیا ہے- اس ناول میں بین المتونیت، فنی تلوطہ (پیسٹچ) خط کی تکنیک، شعور کی رو، تاریخی بیانیہ (ہسٹوریوگرافک میٹا فکشن)، جادوئی حقیقت نگاری، زمانی انتشار (ٹیمپورل ڈسٹورشن وغیرہ کے تجربات کیے گئے ہیں یہ ایک تخلیقی بیانیہ ہے یہ ناول مرزا ہادی رسوا کے ناول امراؤ جان ادا کا سیکوئیل ہے یعنی تسلسل - علی حیدر ثمیلہ، سبیلہ،

نادیہ عنبر لودھی

سردار جہاں، جہاں دار بیگم، سلیمن، بیگا، کمو، تقیہ بیگم، حکیم احمد رضا وغیرہ ناول کے کردار ہیں - ناول کا آغاز یوں ہوتا ہے ''کربلائیں، درگاہیں، مسجدیں، امام باڑے، باغ، روضے، سیرگاہیں اور محل سرائیں میں انھی میں زندہ ہوں اور میرا نام لکھنؤ ہے۔'' اس ناول خواب سراب کا مرکزی کردار علی حیدر مرزا ہادی رسوا کے ناول امراؤ جان کے غیر مطبوعہ مسودے کی تلاش کی کوشش میں سرگرداں ہے اور اس کی اس تلاش کے نتیجے میں امراؤ جان ادا اور فیض کی بیٹی کے بارے میں معلومات ملتی ہے اور امراؤ کی اگلی نسلوں کا پتہ چلتا ہے- پھر ان کرداروں یعنی شمیلہ خانم اور سبیلہ خانم کی کہانی ناول میں شامل ہوجاتی ہے- لکھنؤ تہذیب کا زوال اس ناول کا بنیادی تھیم ہے -طوائفیں، مٹتی ہوئے تہذیب، انہدام ہوتی حویلیاں، اونچے طبقے کے افراد خصوصاً خواتین کے مسائل بیان کیے گئے ہیں یہ ناول متن پر متن تخلیق کرنے کی عمدہ روایت ہے - اس ناول میں نسوانی کردار چھائے ہوئے محسوس ہوتے ہیں تانیثیت کی رو سے بھی یہ ناول اہمیت کا حامل ہے- معاشرے میں خواتین کے کرداروں کو نسل در نسل ہونے والی تبدیلیوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے-علی حیدر کی محبت میں مبتلا خواتین کے جذبات، بڈھی ٹھڈی بیگمات کے احساسات وغیرہ ناول کو رومانیس کی میٹھی کسک سے دوچار کرتے ہیں- ناول کو ناول نگار نے خاصی عرق ریزی کے بعد مرتب کیا ہے لباس سے لے کر موسیقی کے علم تک، مجرے سے رقص کے فن تک اُس معاشرے کے رسوم، رواج، مذہبی روایات، محرم کا جوش وخروش سب کچھ ناول کے صفحات میں سمیٹ دیا گیا ہے- ناول میں کرداروں کی زبان و بیان کے حوالے سے بھی تجربات کیے گئے ہیں -لکھنؤ کی زبان پر ناول نگار کو بہت فخر ہے- وراثت کا نئی نسل تک منتقل نہ ہونا، کرداروں کی اموات، اچکن اور شیروانی کا باہمی فرق سب علامات ہیں جنھیں زوال کی نشانیوں کے طور پر لیا گیا ہے- تیسرا ناول پری زاد اور پرندے نیئر مسعود کے افسانے چمن طاؤس رنگ کا سیکوئیل ہے- نواب واجد شاہ کے طاؤس اُس سے کالے خان نامی ملازم ایک پہاڑی مینا چرا لیتا ہے اور پکڑا جاتا ہے اسے سزا ہوجاتی ہے اس کی بیٹی فلک آرا کی بیٹی فرش آرا سے کہانی شروع ہوتی ہے جو پنجرے بنا کر بیچتی ہے چند کرداروں پر مبنی یہ ناول سادہ بیانیہ لیے

ہوئے ہے فرش آرایہ جاننا چاہتی ہے کہ اس کے نانا کالے میاں کے ساتھ کیا ہوا - اس ناول پری ناز اور پرندے میں انیس اشفاق 'طاؤس چمن کی مینا' کی فلک بوس بلندیوں کو تو نہیں چھو پائے البتہ اردو ادب میں فسانہ سے ناول لکھنا کے تسلسل کو لے کر نیا تجربہ کر گئے ہیں - تینوں ناولوں میں آصف الدولہ اور واجد علی شاہ کے زمانے کے لکھنؤ کی گلیوں، بازاروں اور تہذیب و ثقافت کی جھلک ہے - قاری کو گمان ہوتا ہے کہ وہ مصنف کی انگلی پکڑ کر ان کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے - انیس اشفاق کے ناولوں مین جادوئی منظر نگاری لکھنؤ کی بربادی، کتب خانوں، علم، امام باڑوں، مجلسوں، مسجدوں اور مندروں کا ذکر ہے - انیس اشفاق کے ناول لکھنؤ کی مٹتی ہوئی تہذیب کا نوحہ ہیں لیکن تہذیبیں تو بنتی اور مٹتی رہتی ہیں یہ ہی زندگی کا چلن ہے - ہر عروج کو زوال ہے - فرنگیوں کی ہندوستان پر حکومت اس لیے قائم ہو سکی تھی کہ ہندوستان میں بنیادی انفراسٹرکچر نہیں تھا عوام کے لیے صحت اور تعلیم کی بنیادی سہولتیں نہیں تھیں خود نواب تو سونے کے برتنوں میں کھانا کھاتے تھے اور عوام شدید گرمی میں لائن میں کھڑے ہو کر نواب صاحب کی سواری کا نظارہ کرتے تھے - یہ ہی تفریح ان کے لیے بہت معانی رکھتی تھی - عام انسان غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزار رہے تھے جب کہ بادشاہ، راجا، مہاراجہ، نواب وغیرہ عیش و عشرت کی زندگی اختیار کیے ہوئے تھے ان کی حرم عورتوں سے آباد تھی اور طوائفوں بھی ان کی وظیفہ خوار تھیں - ان ناولوں کو جو کہ لکھنو کی تاریخ و تہذیب پر لکھے گئے پڑھ کر ایسا لگتا ہے جیسے مسلمان نوابوں، حاکموں اور بادشاہوں کو سوائے عیش پرستی کے کوئی کام نہیں تھا - اس لکھنو کے نوابوں نے تو عوام الناس کو بھی عیش پرستی کا اذن عام دے رکھا تھا - یہ ہی وجہ ہے کہ لکھنؤ کے کوچہ و بازار جنس سے آراستہ ہو گئے ان کی محل سرائیں نگار خانے بنتی گئیں اور یوں لکھنؤ پر ایک جنسی ثقافت culture erotic کی چھاپ نظر آنے لگی - لکھنؤ کی تہذیب میں طوائف تہذیبی علامت بن گئی - واجد علی شاہ رنگیلے پیا جان عالم خواتین کا لباس پہن کر رقص کرتا تھا اُس کے پری خانہ میں تین سو خواتین تھیں - ایسے عیاش نواب کو فرنگیوں نے جب محل سے نکالا تو روتا ہوا نکلا - نواب واجد شاہ کو مٹیا برج کلکتہ جلا وطن کر دیا گیا - حضرت محل نے بہادری کا ثبوت دیا اور انگریزوں سے ٹکر لی - انگریزوں نے

حضرت محل سے دشمنی کرتے ہوئے لکھنؤ میں عمارات کا انہدام کیا- املاک کو نقصان پہنچایا - ایک سو ستر سال پرانا لکھنؤ اپنی اصل حالت میں برقرار رہتا یہ تو ممکن نہیں ہوسکتا تھا - وقت کے ہاتھوں تغیر لازم ہے- بدلتی ہوئی زمانے کی روش کا ساتھ دینے والے ہمیشہ کامیاب رہتے ہیں - مسلمان ہمیشہ سے ماضی پرست رہے ہیں - اسی وجہ سے ہندوؤں کے مقابلے میں انگریز مسلمانوں کو دشمن سمجھتے تھے - ماضی کے راگ الاپنے سے تو قومیں ترقی نہیں کرتی - کلچر اس قوم کا ہوتا ہے جو اقتدار میں ہو- مسلمان ہندوستان میں اقلیت میں ہیں- ہندو سرکار کو مسلمانوں کی تاریخی عمارات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے انگریزوں نے ہندوستان کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا بہت ظلم کیا لیکن انھوں نے مڈل کلاس بھی پیدا کی - سرکاری نوکریوں کے ذریعے افراد کی مالی حالت بہتر ہوئی - ریلوے کی سہولت دی ہسپتال سکول، کالج بنائے - امراؤ جان ادا، خواب سراب ناول کی تہذیب طوائف کے گرد گھومتی ہے یہ طوائفیں مسلمان ہیں نواب بھی مسلمان ہیں یعنی مسلمانوں کی تہذیب عیش پرستی ہے؟ یہ ہی لیلا بھنسالی نے اپنی نیٹ فلیکس سیریز ''ہیرا منڈی'' میں دکھایا ہے- ایسی تہذیب کو ناول کی شکل میں پیش کر کے نئی نسل کو کیا پیغام دیا جارہا ہے - وہ نسل جو دین سے ویسے ہی دور ہے ''نیٹ'' جس کا اوڑھنا بچھونا ہے -سنیپ چیٹ، انسٹا گرام، فیس بک اور مائیکرو بلاگنگ کے سحر میں گم نئی نسل ماضی سے نظریں چراتی ہے - حال سے بیزار ہے- مستقبل سے ناامید ہے- کسی شہر کی تاریخ کو ناول کی صورت میں محفوظ کرنا بہت اہم کام ہے قابل ستائش ہے - لیکن ایسا معاشرہ جس میں اسلامی کی بنیادی اقدار کی کوئی اہمیت نہ ہو اس معاشرے کو اغیار غلام بنا لیتے ہیں پھر فرنگیوں کی معاشرتی اقدار بے پردگی، مخلوط محفلیں، گرل فرینڈ کلچر وغیرہ بھی معاشرے کے اقدار کا جزو بن جاتے ہیں - لیکن جس معاشرے کو ہم ناول میں پڑھ رہے ہیں وہ تو پہلے ہی بہت ماڈرن ہے- طوائفوں کے کوٹھے پر شرفا کے بچے شین قاف درست کرنے جاتے ہیں- پھر یہ ہی بچے بلوغت کے بعد طوائفوں کے گاہک بن جاتے ہیں- یہ کون سا اسلام ہے؟ انیس اشفاق کا چوتھا ناول ''ہیچ'' ہے یہ ناول تقسیم ہندوستان کے بعد کے حالات پر مبنی ہے موجودہ عصری صورت حال بھی اس ناول میں دکھائی گئی

ہے- یہ ناول تقسیم ہندوستان کے بعد ہجرت کرنے والے مسلمانوں اور ہجرت نہ کرنے والے مسلمانوں کے مسائل پر روشنی ڈالتا ہے اس سے پہلے بھی کئی ادیب پروین طلحہ، قرۃ العین ، عبداللہ حسین شوکت صدیقی، خدیجہ مستور، انتظار حسین، مستنصر حسین تارڑ، احمد ندیم قاسمی ہجرت کے موضوع پر لکھ چکے ہیں - تقسیم ہندوستان کے بعد ہندوستان میں مسلمان اقلیت بن کر رہ گئے تھے اس اقلیت کو اکثریت نے ہر میدان میں دبانے کی کوشش کی- وہ اپنی زمین پر اجنبی بن کر رہ گئے -لکھنو میں آج کوئی بورڈ اردو زبان میں نہیں ہے صرف انگریزی اور ہندی زبان میں آپ کو سائن بورڈ دکھائی دیتے ہیں ناول سے اقتباس ''اردو وہ کوئی بھی حکومت ہو اس کے حلق سے نہیں اترتی۔ اس ادارے کو فقط ہماری آپ کی منہ بھرائی کے لیے بنایا گیا ہے- اردو کو اس کا حق دینا ان کو گوارا نہیں''- زبان کے علاوہ بھی مسلمانوں کو ملازمتوں کے یکساں مواقع حاصل نہیں ہیں - مسلم تہذیب و ثقافت ہندوستان میں اجنبیت کا شکار ہے- مشرف ذوقی بھی اپنے ناولوں میں ان مسائل کا تذکرہ کرتے رہے ہیں - کہانی لکھنؤ کے پرانے محلے بنجاری ٹولہ کی کی ہے- جہاں تقسیم نے اپنوں کے بیچ ایک لکیر کھینچ دی ہے- کوئی لکیر کے اُس پار جا رہا ہے تو کوئی لکیر عبور کرنے کا ذکر تک سننا گوارا نہیں کرتا- دراصل بن پروں والوں کے لیے زمینیں زنجیریں ہی تو ہوتی ہیں - تقسیم ہندوستان کے بعد ہجرت نے مسلمانوں کو مزید غم ناک کر دیا خاندان کے آدھے افراد ہجرت کر گئے آدھے ہندوستان میں رہ گئے- جو چلے گئے وہ تو گئے سو گئے جو رہ گئے ان کے لیے ان کا اپنا محلہ اپنا علاقہ اجنبی بن گیا- ناول میں ہندوستان کے اور پاکستان کے سیاسی حالات کو بھی شامل کیا گیا ہے- بے شمار قربانیوں کے بعد پاکستان کا وجود عمل میں لایا گیا تھا- جو ملک مسلمانوں کے لیے بنایا گیا تھا- مسلمانوں کو ہجرت کر کے اسے آباد کرنا چاہیے تھا- لاکھوں مسلمانوں نے ہجرت کی تو ہندوستان کے اقلیت کہلانے والے مسلمان بھی ہجرت کر لیتے- قیام پاکستان کے کئی برس بعد تک بھی مسلمان ہجرت کرتے رہے ہیں- مسائل ہر معاشرے میں ہوتے ہیں وقت کے ساتھ سب کچھ بدل جاتا ہے یہ ہی زندگی کی حقیقت ہے-

☆☆☆☆☆

فتح محمد ملک کی تنقید کا تجزیہ مطالعہ

وہ جس کے قرب سے موسم بہکتا جاوے ہے
سخن تو نام پہ اس کے مہکتا جاوے ہے

.....

ڈاکٹر نثار ترابی عصرِ حاضر کے ممتاز محقق، نقاد اور روشن فکر شاعر ہیں انھوں نے پروفیسر فتح محمد ملک کی تنقید نگاری کے حوالے سے نامور اہلِ قلم کے مضامین کو جانفشانی، اور ادبی دیانتداری سے منتخب کر کے فتح محمد ملک کے کثیر الجہات پہلوؤں کو اجاگر کر کے عہد ساز کارنامہ انجام دیا ہے، جو نئی نسل کے لیے گراں بہا ارمغاں سے کم نہیں۔ نثار ترابی نے ''سخن تو نام پہ اس کے مہکتا جاوے ہے'' فتح محمد ملک کی علمی و ادبی عظمت کا کھلے دل سے اعتراف کر کے آنے والے نئے اہل قلم کے لیے پیغام بھی چھوڑا ہے، کہ سینئرز کا احترام ہر صورت کیا جانا بہت ضروری ہے، بدقسمتی سے جو ہمارے ہاں نہیں رہا۔

ڈاکٹر نثار ترابی کے بہ قول!

''جناب فتح محمد ملک نے گزشتہ چھ عشروں میں اپنے فکر و نظر کے وسیلے سے تنقیدی ادب کے روپ میں اردو زبان و ادب کو اتنا کچھ دیا ہے کہ آپ خود ایک داستان، اور ایک سکول کا درجہ اختیار کر چکے ہیں۔''

فتح محمد ملک نامور محقق اور مستند نقاد ہیں ان کے مضامین فکر انگیز ہی نہیں بل کہ بصیرت افروز بھی ہیں جس میں علمیت کے ساتھ ادبی دیانت کی خوشبو بھی محسوس ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنے مضامین میں ہر اہلِ قلم کے لیے خیر کے پہلو نکالے ہیں یہ ان کی جمالیاتی حس ہے کہ فتح محمد ملک نے ادب کے ساتھ وابستگی کو نہ صرف عبادت کا درجہ دیا ہے بل کہ ان کے ہاں حب الوطنی کے جذبے بھی فراواں ہیں ان کا مطالعہ ذات وسیع اور مشاہدہ کائنات عمیق ہے اس لیے انھوں نے اپنے عہد کے ادب کا انتقادی

فرح سنبل

جائزہ عمیق نگاہی سے لیا ہے کہ یہ مشکل کام ایک مستند نقاد ہی کر سکتا ہے مجھے خوشی ہے کہ انھوں نے اپنے مضامین میں معیار کو سامنے رکھ کر اردو ادب میں دامن کو مالا مال کیا ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ فتح محمد ملک کے بارے میں رقمطراز ہیں'' کہ وہ اسلامی اقدار و تہذیب کے احترام کے ساتھ ساتھ ترقی کو زندگی کا پہلا عقیدہ قرار دیتا ہے۔''

انھوں نے فکر اقبال کے خلاف چلنے والی تحریکوں کو استدلال سے رد کیا ہے مغربی استعماری قوتوں نے مسلمانوں کی جہاں جہاں حکومتیں تھیں اکی ارفع اقدار کو نہ صرف مسخ کیا بل کہ روح اسلام کا گلا دبانے کی مضموم کوششیں کیں جو آج تک جاری ہیں۔

دکھ یہ ہے کہ ہمارے اپنے اپنی تہذیب و ثقافت سے نالاں ہی نہیں بل کہ غرب کے دریوزہ گر بھی ہیں۔ فتح محمد ملک اقبال کے نہ صرف گرویدہ نظر آتے ہیں وہ احسان مند ہیں کہ اس عظیم مفکر نے امت مسلمہ کی مردہ روح میں نئی جان بھی ڈالی۔ میں نے اردو کے تمام شعرا کا مطالعہ کیا لیکن اقبال کی شعرزی قاریک وملی تہذیبی اور قومی اقدار کی نہ صرف پاسداری سکھاتی ہے بل کہ عشق محمد دلوں میں اُجاگر بھی کرتی ہے۔ فتح محمد ملک نے پاکستانی کلچر کو بدنام کرنے والوں کو بھی احساس دلایا ہے۔

'' بھلا یہ بھی کوئی تک ہے کہ کروڑوں عوام کا رواں دواں معاشرہ انھیں دکھائی نہیں دیتا مگر موہنجو دوڑ کی رقاصہ انھیں ضرور نظر آتی ہے اس مغربی رقاصہ کا سب سے بڑا ہنر اس کی برہنگی ہے۔''

چند اشتعال پسند عناصر نے روح اسلام کی پاکیزگی اور مسلمانوں کی تہذیب کو ناپاک عزائم سے رنگنے کی جو کوشش کی ہے فتح محمد ملک نے عالمانہ انداز میں پردہ چاک کیا ہے ترقی پسندی کے نام پر میراجی اور ان کے رفقاء اپنے معاشرے کی تحقیر کی سزا آج تک بھگت رہے ہیں اس کے باوجود فتح محمد ملک کو میراجی کے ساتھ ہمدردی ہے جو ان کے محب وطن ہونے کی واضح دلیل ہے۔

فتح محمد ملک تصور پاکستان کو اقبال کی سچی اور دیانت دارانہ تعبیر قرار دیتے ہیں۔ اقبال ان تمام رجحانات کو رد کرتے ہیں جو جدت کے گمراہ کن نام پر اختیار کیے گئے اور ساتھ ہی بات بھی باور کرتے ہیں کہ لا الہ اللہ کا مطلب شارحین اقبال سے سمجھنے کے بجائے خود اقبال کی تحاریر سے سمجھنا چاہیے۔ فتح محمد ملک ایک کھرے سچے اور وطن پرست نقاد ہیں وہ مستشرقین کی اچھائیوں کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں فتح محمد ملک فیض کو خود مانتے ہیں اور احمد ندیم قاسمی کی عظمت کا دوسروں سے منوانا چاہتے ہیں یہ بھی ان

کے والہانہ پیار کا خوب صورت انداز ہے۔
فتح محمد ملک نے اپنی کتاب ''قصہ سازش اغیار'' میں فیض پر لگائے جانے والے الزامات کی دلائل کے ساتھ نہ صرف تردید کی ہے بل کہ الزام لگانے والوں کو خوب رگیدا ہے۔ تنقید راشد میں فتح محمد ملک کی ''فکری تعبیر'' میں کہتے ہیں کہ اردو تنقید نے راشد کے ہاں ہیئت اور آہنگ کی تحسین کا حق خوب ادا کیا ہے، کہ شعر راشد کے ہاں فکری اور نظریاتی محاسن کی طرف نقادوں نے کوئی خاص توجہ نہیں دی وہ ان کی شخصیت کو واضح کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ ان کو بڑا دکھ ہے کہ نامور ہستیوں کو ہمارے تعلیمی نصاب اور ذرائع ابلاغ سے بے دخل کر دیا گیا ہے جنھوں نے پاکستان کے لیے خون پسینہ بہایا تھا۔ وہ ''منٹو اور نئی تعبیر'' میں لکھتے ہیں، ان کے ہم عصروں میں احترام انسانیت کا احساس نہیں مل سکا۔ فتح محمد ملک منٹو کی ذات پر لگائے گئے اعتراضات کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں ہماری سوچ میں زرخیزی کا فقدان ہے جو منٹو میں موجود تھی۔ میرے خیال میں ہمیں اپنی اپاہج سوچ کا علاج کرانا ہوگا کیوں کہ یہاں اس کو سزا دی جاتی ہے جو سچ اور حق کی بات کرتا ہے۔ فتح محمد ملک قلم کے مجتہد ہیں قیام پاکستان سے لے کر تا حال کوئی بھی انقلابی اور معاشی نظام قائم نہیں ہو سکا۔ ملک صاحب کہتے ہیں کہ پاکستانی عوام کو اسلام کی اصل روح سے روشناس کرنے کے بجائے ملائیت اور خانقاہیت بڑے وسیع پیمانے پر متعارف کرائی گئی، جو استعماری قوتوں کی سازشوں کا نتیجہ ہے۔ قائداعظم کے بہ قول!

''میری جیب میں کھوٹے سکے ہیں' کرب کا عالم یہ ہے تا حال ہمارے وطن عزیز میں کھوٹے سکے بڑی سینہ زوری سے چلائے جا رہے ہیں۔ اہل سیاست اہل دربار سے کہیں زیادہ اہل دانش پر اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ دانشوروں نے اس سے نظریں چرائی ہیں۔ کیوں کہ ہمارے حکمرانوں نے مفادات کے کشکول سامنے رکھے۔ فتح محمد ملک مثال دیتے ہیں کہ ہمارے خلفائے راشدین میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ مسجد نبوی کے صحن میں ایران سے لائے گئے مال غنیمت کے انبار دیکھ کر بے ساختہ رو پڑے تھے شاید انھیں درویشانہ زیست کا مسلک خطرے میں دکھائی دیا۔ لیکن آج کے امراء نام نہاد اشرافیہ کے پیٹ کا حرص جہنم بھی نہیں بھر سکتی۔ فتح محمد ملک فلسطین کے حوالے سے اقبال کے قول کو حرف اول و آخر گردانتے ہوئے سراہتے ہیں کہ انھوں نے 1937 میں جو کہا تھا وہ آج بھی صادق ہے کہ عرب ممالک اس قابل ہی نہیں کہ اعتماد سے

فلسطین کو آزادی دلوا سکیں۔

فتح محمد ملک کی آپ بیتی ''آشیاں در آشیاں'' میں بھٹو کے بارے میں ایسے انکشاف کیے ہیں پڑھ کر خوشی ہوئی ہے کہ بھٹو وطن دوست اور عوام دوست تھے انھوں نے واضح کیا تھا ہم گھاس کھا کر بھی ایٹم بم بنائیں گے جو بھی اس ملک سے وفاداری کرتا ہے اسے موت کی آغوش میں سلا دیا جاتا ہے۔ یہاں مجھے معروف ترقی پسند شاعر جسارت خیالی کا شعر بڑی شدت سے یاد آ رہا ہے۔

صدائے حق کی خاطر ہر قدم پر
صلیب غم پہ لٹکایا گیا ہوں

طاہرہ اقبال کے بہ قول!

''ہمارا حکمران طبقہ اورنگ زیب عالمگیر کے نااہل جانشینوں کا جانشین ہے۔''

میرے خیال کے مطابق ہم کوئی قوم ہی نہیں ہیں کیوں کہ خوددار قوم کی ایک تہذیب ایک لباس اور ایک زبان ہوا کرتی ہے اور اسی لیے ہم غلام ابن غلام ہیں اور سونے پہ سہاگہ حکمران بھی تعیش پسند کرپٹ اور لٹیرے ہیں آزاد اور زندہ قومیں اپنی دھرتی اپنی اقدار اور روایت کی پاسداری ہوتی ہیں لیکن وطن عزیز میں تباہی کے خوں چکاں مناظر دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے میرے خیال میں اس تباہی کے ذمہ دار ہمارے حکمران اور ادارے ہیں جنھوں نے اپنے ذاتی مفادات کی خاطر ملک کو گروی رکھ دیا ہے اسی لیے ہمارا ہر شعبہ زندگی مفلوج ہو کر رہ گیا ہے۔ فتح محمد ملک نے ان مضامین میں سچ اور ایمانداری سے اپنے قلم کا حق ادا کیا ہے اور اپنے قابل قدر نظریات اور بے پناہ صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے ڈاکٹر نثار ترابی کو میں خراج تحسین پیش کرتی ہوں کہ انھوں نے گراں بہا معلومات کا خزینہ ہم تک پہنچایا ہے ڈاکٹر نثار ترابی نے فتح محمد ملک جیسی عظیم علمی شخصیت کا دلاویز نقشہ کھینچ کر ہم جیسے طالب علموں پر احسان کیا ہے۔

ڈاکٹر نثار ترابی کے بہ قول!

''فتح محمد ملک ادب کو محض ذریعہ اظہار نہیں سمجھتے بل کہ اسے اسلوب حیات مانتے ہیں''

آخر میں اتنا کہوں گی کہ فتح محمد ملک بطور نقاد، انشائیہ نگار، کالم نگار، افسانہ نگار، خاکہ نگار سوانح نگار سفر نامہ نگار ترجمہ نگار الغرض ہر صنف میں ان کا کام انتہائی عمدہ نوعیت کا اور بصیرت افروز ہے جسے تاریخ کبھی فراموش نہیں کرے گی ان کی خوبصورت بات جو مجھے بہت پسند آئی۔

''میں سخت متعصب ہونے کے باوجود تعصب سے عاری ہوں''

اس تناظر میں فتح محمد ملک کی جمالیاتی حس میں محاسن کے علاوہ کوئی گنجائش نہیں۔ میری دعا ہے کہ وہ سلامت باکرامت رہیں۔

☆☆☆☆☆

اپنے محترم سبطین شاہجہانی کے بارے میں [اظہارِ جذبات]

تاریخ لاہور کا ایک راوی یوں روایت کرتا ہے،

اے پیارے لوگو! بہت اچھے دنوں کا ایک قصہ سنو۔ سچ مُچ کی بات ہے۔ نہ لاگ ہے، نہ لپیٹ، نہ جھوٹ ہے نہ کپٹ ہے۔ مُجددِ زماں ہم (اسد اریب) اور قطبِ عارفاں حضرت سبطین شاہجہانی مدظلہ کوئی لگ بھگ پینسٹھ برس پہلے باہم یکجا ہوا کرتے تھے، پیسہ اخبار انارکلی لاہور کی ایک خستہ جاں عمارت ریاست صاحب کا نامی پریس تھا، کبھی امامیہ مشن کا دفتر بھی وہیں تھا، ابرار شیرازی، ع غ کراروی، ناصر زیدی، وحید الحسن ہاشمی سے علمی معارف و مکاشفاتِ سخن پر بحثیں ہوئیں، ملاقاتوں کا ایک زمانہ تھا۔ پھر ہم مزنگ بازار مہر بُستا کی لائبریری میں تنقیدی اجلاسوں کا بول بالا کرتے، بیدل حیدری، اظہر ناسک، ظہور فاروقی، نامدار خان، ضمیر فاطمی، حسن ظہیر، مسعود کھدر پوش، حادی ملتانی، عظیم قریشی، کیسے کیسے اہلِ کمال اس جگہ بیٹھتے، سبطین شاہجہانی ایک نو عمر جوان کی شاعرانہ چُلبت پھرت اِن سب عمدگانِ علم میں اپنا ایک الگ رنگ روپ دکھاتی، خدا جانے اب کون اس مکانِ ہستی میں اب تک مقیم ہے اور کون چلا گیا۔ مہر بُستا لائبریری میں آنے والوں، ایک ایک کا چہرہ آنکھوں میں گھوم رہا ہے۔ راجا رسالو، علامہ عقیل لاہوری، خیال امروہی، روح العین یزرک، خواجہ محمد زکریا (اب ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا) جیسے بڑے بڑے

اسد اریب

یادگار زمانہ لوگوں میں سبطین اور ہم نے شعر و سخن اور علم و ادب کے ٹھاٹ باٹ دیکھے، یہ زمانہ ہے انیس سو پچپن سے ساٹھ تک کا۔ انہی دنوں ایک خاتون مجسٹریٹ لاہور ہوا کرتی تھیں، ثریا عظیم، سماجی اور علمی شخصیت تھیں، یہ بھی ان تقریبات میں آیا کرتیں۔ سبطین شاہجہانی نے ترقی پذیر پاکستان کے ابتدائی پندرہ سولہ برسوں میں ادبی پرورش کے دوران اپنا رنگ روپ سنوارا۔ پھر ہم حکیم نیئر واسطی کے گھر شیرانوالا دروازے تک اپنی بیاضِ شعر لیے کلام سنانے جا پہنچے، سبطین شاہجہانی کا نام اس وقت نگارانِ سخن نعت میں مشہور ہونے والا لگا۔ پھر وہ ہارون رشید ارشد، نصرت قریشی، سیف زلفی کے درباران سخن میں آنے جانے لگے۔ حکیم جمال سُویدا دہلوی سے بھی عقیدت کا ڈول ڈالا۔

مگر اب کوئی بیس برس سے کتابیں رسالے، اخبار دیکھتا ہوں۔ جگہ جگہ یہ حضرت مجھے بچوں کے نمائندہ خیال شاعر کے طور پر نظر آنے لگے۔ بچوں کے شعری ادب میں اسلامی اخلاقیات اور مشرقی تہذیب و تمدن کے روشن مظاہر کی جس عمدگی سے جناب نے مصوری کی، بچوں کے ادب میں وہ ایک ستارۂ امتیاز کی حیثیت رکھتی ہے۔

آج سے پینسٹھ برس قبل پہلے پہل جب میرے آج والے سلطانُ الاصفیاء زُبدۃُ الاولیاء سبطین شاہجہانی سے ملا، تب وہ صاف ستھرے چہرے، بقول عظیم قریشی چکنے چپڑے کلّے والے نوخیز شاعر تھے۔ پھر نعت گوئی میں شرف امتیاز پایا۔ ایک زمانے تک بچوں کے لیے نظمیں لکھتے رہے اب تمثال مبارک دیکھتا ہوں، اپنے نام آئے ہوئے ان کے خطوط کی سجاتی عبارتیں پڑھتا ہوں، معلوم ہوتا ہے میرے یہ دیرینہ دوست، یارِ قدیم، سبطین شاہجہانی صاحبِ سجادہ، خرقہ پیرہن ایک صوفی بزرگ ہیں مجھے یقین ہے ان جیسا روشن ضمیر شخص جس حال اور قال میں بھی ہوگا، بندگانِ خدا کا دوست رہے گا۔

میں ہمیشہ سے ان کی پاکیزہ طینت اور طبیعت کی خوش اندیشی کا معترف چلا آتا ہوں، یہ صوفی صافی لوگ سادہ فطرت، محبت کے پسینے میں شرابور رہتے ہیں۔ حضرت اقبال سے غلط فہمی ہوئی، وہ فقیہ و صوفی و ملّا کی ناخوش اندیشی کا شکار ہوئے۔ مگر میں نے صوفیاء کو ہمیشہ خوش اندیش پایا۔ میرے عظیم انسان بزرگ دوست، حضرت سلطان الاصفیاء صوفی سبطین شاہجہانی کا نام بھی محبت افروز ایسے انسانوں کی شمار میں سرِ فہرست لکھ لیجیے۔

☆☆☆☆☆

نثار ترابی کی خوشبودار شاعری

نثار ترابی ایک کہنہ مشق سینئر شاعر ہیں ان کا تازہ ترین مجموعہ کلام ''خوشبو آواز دیتی ہے'' پڑھنے کا موقع ملا جو 2025 میں دھنک مطبوعات اُردو بازار، لاہور کے اہتمام سے شائع ہوا۔

کتاب کا انتساب کچھ دعائیہ اور امید افزا اشعار کی صورت میں پڑھنے کو ملا اور آنکھیں بھیگ کے رہ گئیں۔ آپ بھی دیکھیے:

ہر جانب امن کے رستے ہوں
اور ان پر پھول برستے ہوں
ہر بچھی ہو آزاد یہاں
ہر شاخ پہ پتے ہنستے ہوں
ہر سانس پہ علم کا سایہ ہو
پھولوں کے ہاتھ میں بستے ہوں
ہر گھر میں پیار کی خوشبو ہو
دالانوں میں گلدستے ہوں
ہر آنکھ میں خواب رہیں زندہ
سکھ چین کو دل نہ ترستے ہوں
ہر موڑ پہ خیر کے ہوں چشمے
اُمید بھرے چورستے ہوں
خوشیوں پر کوئی قید نہ ہو
بچوں کے کھلونے سستے ہوں
ہو عدل کا راج ہی دنیا میں
ہر سو انصاف کے رستے ہوں

.....

یہ بنیادی طور پر ایک غزلیہ مجموعہ کلام ہے جس کے تقریظ نگار اس عہد کے چار ممتاز لکھاری فتح محمد ملک، ناصر علی سید، ڈاکٹر پیرزادہ قاسم اور ڈاکٹر نذر عابد ہیں، جو کتاب کے عمدہ معیار کی جانب اشارہ ہے۔ 176 صفحات کی کتاب میں 130 غزلیں شامل کی گئی ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ فتح محمد ملک نے نثار ترابی کو ''سخن ہا زناں گفتن'' کے بجائے شاعری کو قومی مستقبل کے لیے نسخہ شفا بنانے پر نثار ترابی کی تحسین کی ہے خاص طور پر اس کلام میں امید اور رجا کے تناسب پر شاعر کو بہت سراہا ہے اور ایک قدم بڑھ کر ان کے کلام کو

رحمان حفیظ

حرفِ حق بھی قرار دیا ہے۔

ناصر علی سیّد نے بھی اپنی رائے میں نثار ترابی کو رجائیت کا دامن تھامے ہوئے امکان کے پھول کھلائے پر داد و تحسین سے نوازا ہے۔ ڈاکٹر نذر عابد نے بالواسطہ طور پر نثار ترابی کو لمبی دوڑ کا اَن تھک کھلاڑی قرار دیا ہے جب کہ ڈاکٹر پیرزادہ قاسم سمجھتے ہیں کہ نثار ترابی نے شاعری کے سپاٹ منظرنامے میں رنگ بھر دیے ہیں وہ انھیں نہ صرف صاحبِ طرز بل کہ صاحبِ لہجہ شاعر قرار دیتے ہیں۔

اس کتاب کے حوالے سے میرا تجربہ یہ ہے کہ اسے شروع سے آخر تک پڑھتے چلے جانے میں کوئی اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی اور جابجا اوپر درج خیالات کی تصدیق ہوتی ہے۔ نثار ترابی کو لکھتے ہوئے چار دہائیوں سے زیادہ کا وقت گزر چکا ہے اور ان کے کلام کو ان کے انداز کے حوالے سے شناخت کیا جاسکتا ہے - ان کا اسلوب تحریر ذمہ دارانہ ہے۔ اس کتاب کی غزلوں میں کہیں غیر ضروری توڑ پھوڑ نہیں دکھائی دی اور اصول و ضوابط کے علاوہ غزل کی عظیم تاریخی روایت کا احترام بھی روا رکھا گیا ہے۔ جابجا عمدہ اشعار پڑھنے کو ملتے ہیں۔ وہ کھردرے الفاظ اور ناگوار اسلوب سے بچ کے رہتے ہیں۔

ان کی علامتیں دلکش اور لطیف ہیں جیسے فاختہ، شجر، پرندہ، چراغ، خوشبو دریا، سمندر وغیرہ جس سے ان کلام نارمل اور ملائم رہتا ہے۔ درست اور عمدہ مصرعے زبان و بیان کی کئی خوشبوؤں سے آراستہ اور جابجا صنائع و بدایع سے مزین بھی ہیں۔ کہیں کہیں نئی زمینوں کا سحر بھی نظروں کو جکڑتا ہے۔

ان کے مجموعہ غزل میں سے چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں:

ہر کسی سے بیان نہیں ہوتا
آدمی داستان نہیں ہوتا

اس کی نظروں میں نظاروں کی چمک ایسی ہے
کہ اسے دیکھ کے آئینے سنور جاتے ہیں

سکوتِ گنبدِ جاں میں عجیب طلاطم ہے
نجانے کتنی صدائیں ہیں ہم سفر میری

نظر اُٹھی ہے جدھر بھی ادھر تماشا ہے
بشر کے واسطے جیسے بشر تماشا ہے

نظر پڑی تو کسی اور داستان میں ملا
میں جس کے ساتھ کہانی میں چل کے آیا تھا

تیری رفاقتِ خوش گام ہی سے کھلتا ہے
جو تو نہ ہو تو یہ موسم سہانا کچھ بھی نہیں

مرے سخن میں یونہی روشنی نہیں آئی
ترے خیال نے پلکیں اُٹھا کے دیکھا ہے

عجب نہیں کہ کسی روز موج میں آکر
اچھال دے تیرے دریا کی کوئی لہر مجھے

یوں دیکھنے کو جہاں میں کہاں نہیں ہیں ہم
جہاں پہ رہنا تھا ہم کو وہاں نہیں ہیں ہم

شعلوں کو ہوا دینے سے جان لرزاں تھی
اپنی حدت تیرے رخسار میں رکھ آئے ہیں

☆☆☆☆☆

بلوچستان کا قیمتی سرمایہ ''ریاض ندیم نیازی''

ریاض ندیم نیازی کو میں پندرہ/بیس سال سے جانتا ہوں، لیکن میں سمجھتا تھا کہ اُن کی ادبی اور سماجی سرگرمیاں صرف اخبارات اور ادبی رسائل و جرائد تک ہی محدود ہیں، مگر چند ماہ قبل بلوچستان تعلیمی بورڈ کی جانب سے ایف اے اور ایف ایس سی کے سالانہ امتحانات کے دوران، میں سبّی کے امتحانی سینٹرز میں سرکاری دورے پر آیا تو وہاں بھی میری ریاض ندیم نیازی سے ملاقات ہوئی۔

گزشتہ روز جب میں اُن کی ماموں زاد بہن کی وفات پر فاتحہ خوانی کے لیے اُن کی رہائش گاہ سبّی آیا تو اُن کی ذاتی لائبریری دیکھ کر حیران رہ گیا، تین کمروں پر مشتمل گھر کتابوں سے بھرا ہوا تھا، ہزاروں نادر و نایاب اُردو ادب کی کتب اس لائبریری میں موجود تھیں جنھیں دیکھ کر خوشی بھی ہوئی اور حیرت بھی۔ اس سے پہلے مجھے کسی نے نہیں بتایا کہ وہ شاعر و ادیب اور درجنوں کتابوں کے مصنف ہیں۔ مجھے پتا چلا کہ ریاض ندیم نیازی کے حمد و نعت، مناقب و سلام، غزل و نظم اور ہائیکو سمیت ۱۵ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں دو کتابوں کو قومی صدارتی ایوارڈز جب کہ پاکستان بھر کے صوبائی سطح کے بے شمار ایوارڈز اور اعزازات کے ساتھ اُنھیں نقد انعامات اور اعزازی شیلڈز سے بھی نوازا جا چکا ہے۔

ریاض ندیم نیازی شاعر و ادیب اور نعت گو ہونے کے ساتھ ساتھ خوش الحان نعت خواں بھی ہیں۔ مجھے اُن کی آواز میں ترنم سے نعت سن کر بے حد خوشی محسوس ہوئی۔ اُنھوں نے جو کتابیں لکھی ہیں وہ کام اپنی جگہ ہے، لیکن اُن کے کام پر پاکستان کی مختلف یونیورسٹیوں سے ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی سطح پر تحقیقی مقالے دیکھ کر انتہائی خوشی ہوئی اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ میں ساری زندگی محکمۂ تعلیم سے وابستہ رہا ہوں، میں نے اپنی زندگی میں بلوچستان کی سطح پر اتنا وقیع اور سرمایۂ ادب قسم کا کام کسی دوسرے شاعر و ادیب کا نہیں دیکھا..... ہو سکتا ہے ہوا ہو، لیکن میری نظر سے نہیں گزرا۔ لہٰذا اِس بنا پر میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ریاض ندیم نیازی واقعی بلوچستان کا قیمتی سرمایہ ہیں، ملک بھر میں اُن کی پہچان اسی سرزمین سے ہے، لیکن مجھے یہ دیکھ کر دُکھ ہوا کہ اُن کی اپنے شہر میں کسی نے قدر نہیں کی۔ گورنمنٹ ملازم ہونے کے باوجود اُنھیں سرکاری طور پر کوئی مکان تک الاٹ نہیں ہو سکا، اُن کے آفس کے افسرانِ بالا نے کبھی اُن کے گھر آ کر اُن کی لائبریری نہیں دیکھی، اگر دیکھ لیتے تو شاید ترس کھا جاتے۔ زندگی فانی ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ریاض ندیم نیازی کا یہ اُردو ادب کے فروغ، ترویج اور اشاعت کا کام زندہ رہے گا اور اُن کے نام اور کام سے

کلیم اللہ زاہد

بلوچستان کا نام جڑا رہے گا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ تنخواہ دار آدمی ہیں اپنے سرکاری محکمے میں فرائضِ منصبی انتہائی ذمے داری اور دیانت داری سے انجام دے رہے ہیں۔ آج کی ہوش ربا مہنگائی میں کتاب چھپوانا سب سے مشکل عمل ہے۔ ریاض ندیم نیازی نیک نیت اور درویش صفت انسان ہیں، اس لیے اُن کی کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے کوئی نہ کوئی وسیلہ بنا دیا ہے اور اُن کی کتابوں کی خوب صورت اور دیدہ زیب و دل کش اشاعت اِس وسیلے سے مسلسل ہو رہی ہے۔ اُمید ہے آئندہ بھی ہوتی رہے گی۔

زندہ قومیں اپنے اہلِ فکر و دانش کو ہر طرح سر آنکھوں پر بٹھاتی ہیں اور اُن کی قدر افزائی کو اپنے لیے اعزاز جانتی ہیں۔

میں چاہوں گا کہ اُن کو حکومتِ بلوچستان کی جانب سے سبّی میں ایک کشادہ مکان دیا جائے جس میں یہ بلوچستان کا نمائندہ شاعر و ادیب اپنی بقایا زندگی کو آرام و راحت سے گزار سکے۔ اس کے علاوہ اُن کی بے مثال خدمات کے اعتراف میں ایک علمی و ادبی ادارہ/ ریسرچ سینٹر/ آرٹس کونسل قائم کی جائے۔ اس ادارے کی اپنی مستقل شایانِ شان عمارت ہو اور اس کے اخراجات پورے کرنے کے لیے حکومت کی طرف سے رقم مختص کی جائے۔ لہٰذا میری اس گزارش اور سفارش پر صاحبانِ اقتدار و صاحبانِ اختیار توجہ فرمائیں اور بلوچستان کے اِس نمائندہ ادیب و شاعر کے ساتھ ہر قسم کا تعاون فرمائیں اور اُن کی حوصلہ افزائی کریں تاکہ یہ زیادہ سے زیادہ اُردو ادب کے کارہائے نمایاں سرانجام دیتے رہیں اور بلوچستان کا نام مزید روشن کرتے رہیں۔

مجھے یہ سن کر دلی خوشی ہوئی کہ اب ریاض ندیم نیازی کو پاکستان بھر کے مشاعروں، مذاکروں اور ادبی و نعتیہ پروگراموں میں بلوچستان کی نمائندگی کرنے کے لیے مدعو کیا جاتا ہے۔ وہ پاکستان بھر میں جاتے ہیں اور ہر علاقے میں منعقدہ پروگراموں میں شرکت کر کے بلوچستان کا نام روشن کرتے ہیں اور عوام و خواص کے دلوں میں یہ بات راسخ کرتے ہیں کہ وہ سبّی بلوچستان سے آئے ہیں اپنے خطے، علاقے اور صوبے کی نمائندگی کرنے کے لیے۔ وہ اپنی سرزمین اور اس کی مٹی سے بہت محبت کرتے ہیں، اُن کی محبت اور وفاداری کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں زیادہ سے زیادہ بلوچستان کی پولیس، ایف سی، رضا کار اور افواجِ پاکستان کا ذکر کیا ہے، اُن کے قصیدے لکھے ہیں۔ شہدائے بلوچستان کو خراجِ عقیدت و خراجِ تحسین پیش کیا ہے وہ جہاں بھی جاتے ہیں بلوچستان کی تہذیب و ثقافت کو متعارف کراتے ہیں اور اکثر انعامی مقابلہ جات جیت کر اپنے صوبے بلوچستان کے مکینوں کا سر فخر سے بلند کرتے ہیں۔ یہاں تک معلوم ہوا ہے کہ اُن کا جب بھی کوئی کلام کسی ادبی رسالے یا اخبار میں شائع ہوتا ہے تو اُس کے ساتھ بھی ریاض ندیم نیازی کے ساتھ ہمیشہ سبی (بلوچستان) لکھا ہوا ہوتا ہے۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کے علم و عمل، رزق و روزگار، کاروبار، زندگی، صحت اور زورِ سخن میں مزید اضافہ فرمائے۔ آمین

☆☆☆☆☆

ناول ''پیرو'' میں متبادل بیانیے کی تشکیل

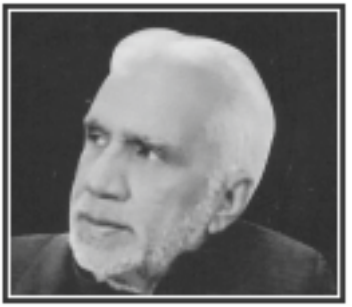

آزاد مہدی اُردو کے اہم اور منفرد ناول نگار ہیں جو اس وقت شاہدرہ میں رہائش پذیر ہیں۔ ان کے فکشن میں اس علاقے کی تاریخی، تہذیبی اور سماجی فضا شدت سے نمایاں ہوئی ہے۔ ان کی خوبی ہے کہ وہ مقامی تہذیب کے معمولی اور نظر انداز کیے گئے کرداروں کو مرکزِ نگاہ بناتے ہیں اور ان کے توسل سے معاشرتی اور معاشی مسائل کو اجاگر کرتے ہیں۔ ان کے بیشتر ناولوں میں طبقاتی کشمکش، غربت، حاشیے میں موجود انسان، سماجی ناہمواری، معاشرتی ناانصافی، انسانی نفسیات اور شہری زندگی کے تضادات کو حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ان کی نثر سادہ، سہل اور عام فہم ہے لیکن اس میں علامتی اور استعاراتی پہلو بھی ملتے ہیں جو ان کی نثر کو محض بیانیہ نہیں رہنے دیتے بل کہ فکری گہرائی عطا کرتے ہیں۔

ان کا تازہ ناول ''پیرو'' اس حوالے سے خاص اہمیت کا حامل ہے جس میں شاہدرہ اور اس کے گردونواح کی تہذیبی زندگی، معاشرتی جبر اور انسانی رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ کو نہایت حساس اور اثر انگیز انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس ناول کے کردار محض فرد نہیں بل کہ ایک پورے سماجی نظام کی تشکیل کرتے ہیں۔ اس ناول میں سماج واضح طور پر دو طبقوں میں تقسیم ہوتا دکھایا گیا ہے۔ ایک طرف مراعات یافتہ، طاقتور اور سماجی طور پر موثر طبقہ موجود ہے اور دوسری جانب غریب، مجبور اور سماج کا پسا ہوا طبقہ موجود ہے۔ غریب، مجبور اور حاشیے پر موجود طبقے کی نمایندگی پیرو جیسے کردار سے کرائی گئی ہے جو غربت، بے بسی اور سماجی استحصال کا شکار ہے۔ اس کردار کے ذریعے ناول نگار نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح انسان کی معاشی کمزوری اس

عبدالعزیز ملک

کے خواب، شناخت اور اخلاقی اقدار کو مسخ کر کے رکھ دیتی ہے - ناول میں موجود مذہبی ادارے، فرسودہ روایات اور لوگوں کے منافقانہ رویے انصاف کی فراہمی کے بجائے جبر کو مضبوط کرتے نظر آتے ہیں۔

آزاد مہدی نے مذکورہ ناول میں پیرو کے ذہنی انتشار کو محض نفسیاتی مسئلہ نہیں بلکہ سماجی جبر، کھوکھلی اقدار اور لوگوں کے منافقانہ رویوں کی پیداوار کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس کا ذہنی انتشار داخلی نوعیت کا حامل ہے۔ وہ مکمل پاگل پن کا شکار نہیں بل کہ اس کا دیوانہ پن مسلسل دباؤ، سماجی تضحیک اور منافقانہ رویوں سے جنم لیتا ہے۔ دوسری طرف معاشی محرومی اس کے داخل کو توڑ پھوڑ دیتی ہے۔ پیرو، اس داخلی کرب کو برداشت کرتا ہے۔ وہ سب کچھ جانتا اور سمجھتا ہے لیکن بدل نہیں سکتا۔ اس کا کرب اس کے شعور کے ساتھ جڑا ہوا ہے جو اسے المیہ کردار میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اس مرحلے پر اس کا کرب وجودی نوعیت اختیار کر لیتا ہے کیوں کہ وہ گہرے اندرونی اضطراب کو اپنی ذات میں سمیٹے ہوئے زندگی میں ضمیر کا سودا نہیں کرتا۔ یوں وہ مصدقہ زندگی گزارتا ہے اور ہجوم میں بھی تنہائی کا شکار ہو جاتا ہے۔ وجودی فلسفی کریکیگارڈ نے اسے یقین اور بے یقینی کے مابین معلق کیفیت قرار دیا ہے۔ انسان کا عام دکھ کسی واقعے سے جڑا ہوتا ہے جبکہ پیرو کا کرب زندگی کی کلیت سے جڑا ہوا ہے۔ عام دکھ عارضی ہوتا ہے جبکہ اس کا دکھ مستقل اور طویل ہے جس نے اس کے باہر سے نہیں بل کہ اس کے اندر سے جنم لیا ہے یوں پیرو کا دکھ وجودی کرب میں تبدیل ہو کر فرد سے انسان کا سفر طے کر جاتا ہے۔ اس کا راتوں کو جاگنا اور دیر تک روتے رہنا، ایک ایسا خاموش، گہرا اور فکری دکھ ہے جو قاری پر، کمزوری کے بجائے شعور کی طاقت بن کر ظاہر ہوتا ہے۔ سماج، اقدار اور رشتے اسے مطمئن نہیں کر پاتے، وہ سماجی منافقتوں اور معاشرے کے کھوکھلے رویوں پر سوال اٹھاتا ہے مگر اسے جواب نہیں ملتا، ایسا کرب پاگل پن سے زیادہ شعور کی علامت ہوتا ہے جو ''پیرو'' کے کردار میں قاری کے سامنے ظاہر ہوتا ہے۔ ایسے کردار ژاں پال سارتر، البرٹ کامیو اور دوستوفسکی کے ہاں ملتے ہیں۔

وجودیت پسند فلسفیوں کا خیال ہے کہ جب دنیا بے معنی لگنے لگے تو فرد کا نارمل رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب ہوگا کہ پاگل پن معنی کی تلاش کا نام ہے۔ اس لیے ہر پاگل فرد ذہنی طور پر بیمار نہیں ہوتا، بعض اوقات وہ سماج سے زیادہ باشعور ہوتا ہے۔ فرانس کے معروف فلسفی مشل فوکو نے اپنی کتاب Madness And Civilization میں اس مفروضے کو چیلنج

کیا ہے کہ جنون یا پاگل پن ایک بیماری ہے۔اس کے خیال میں جنون سماجی تشکیل ہے جسے طاقت ور ادارے اس فرد کے خلاف استعمال کرتے ہیں جو رائج ''نارمل'' اقدار سے انحراف کرے۔ بین الاقوامی سطح پر فکشن کے مطالعہ کریں تو یہ صورت حال، ولیم شیکسپیئر (ہیملٹ)، البرٹ کامیو (اجنبی)، فرانز کافکا (مقدمہ)اور دوستوفسکی کی کہانیوں میں دکھائی دیتی ہے جہاں جنون کی کیفیت کو لکھاریوں نے سیاسی جبر، تاریخی صدمے اور طبقاتی ناہمواری کے خلاف احتجاج کے طور پر استعمال کیا ہے۔اردو میں قرۃ العین حیدر کے ناول ''آگ کا دریا'' میں کرداروں کی ذہنی بے سمتی اور زمانی انتشار کو تقسیم ہند، تہذیبی شکست وریخت اور شناخت کے بحران کو واضح کرنے کی غرض سے بطور تکنیک استعمال کیا گیا ہے۔اسی طرح سعادت حسن منٹو نے بشن سنگھ کے ذہنی انتشار کو تقسیم ہندوستان پر طنز کے لیے استعمال کیا ہے جبکہ ''پیرو'' کا جنون آزاد مہدی نے تاریخ اور تہذیب کے منافقانہ رویوں اور ریاکاری کے خلاف مزاحمت کے طور پر پیش کیا ہے۔ ''پیرو'' کا کردار نارمل رہ کر سماجی اقدار کا جھوٹا تسلسل قبول کرنے کے بجائے، ذہنی انتشار کے ذریعے سچ کو ظاہر کرتا ہے۔یوں پیرو کا پاگل پن یا جنون اس کی کمزوری نہیں بل کہ سماجی طاقت کے خلاف ایک خاموش بغاوت ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ سماج کی ''نارملٹی'' پر سوالیہ نشان ہے۔

آزاد مہدی نے ناول ''پیرو'' کے ذریعے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہر عہد اپنی نارملٹی خود طے کرتا ہے، جو فرد اس نارملٹی سے ہٹ جائے اسے پاگل، منحرف اور جنونی قرار دے کر سماج سے باہر کر دیا جاتا ہے۔ انھوں نے مذکورہ ناول کے بیانیے کی مدد سے طاقت کے بیانیے کو غیر مستحکم کرنے اور کچھ ایسے سچ جو فراموش کر دیے گئے تھے یا حاشیے پر دھکیل دیے گئے تھے، انھیں سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ خاص طور پر ضمیر کی آواز کو سننا اور ریاکاری و منافقت کو رد کرنا ایسا سچ ہے جو جدید دور میں فراموش کر دیا گیا تھا انھوں نے پیرو کے کردار کی مدد سے اُسے بیان کر کے Counter Discourse تشکیل دینے کی کوشش کی ہے۔ حیرانی اس بات پر ہے کہ موجودہ دور کے ناقدین نے ان کے ناول ''پیرو'' کو متبادل کلامیے کی تشکیل کی صورت میں کیوں نہیں دیکھا حالاں کہ اس ناول میں اس کے واضح اشارے موجود ہیں۔

☆☆☆☆☆

جمیل حیات: فراق لمحوں کا داستان گو شاعر

جمیل حیات اردو ادب کے استاد ہیں۔ ان کا ادبی میدان افسانہ اور ناول ہے اور وہ انہی دونوں اصناف میں تنقید بھی کرتے ہیں۔ لیکن انھیں شاعری سے بھی شغف ہے اور وہ اتنے دلربا انداز میں شعر پڑھتے ہیں کہ سامع کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔ ان کی شاعری ملک کے مختلف اہم ادبی جرائد میں شائع ہوتی رہی ہے۔ فراق ایک ایسا موضوع ہے جس پر بہت سے شعرا نے اشعار کہے ہیں۔ اس موضوع پر جمیل حیات نے بھی بڑے پُر درد شعر کہے ہیں۔ جمیل حیات فراق لمحوں کے بہت عمدہ اور پُر درد داستان گو شاعر ہیں، جن کی شاعری دل کے تاروں کو چھیڑ کر رکھ دیتی ہیں۔ وہ اتنے دلفریب انداز میں شعر کہتے ہیں اور شعر کی صورت بکھرے ہوئے موتیوں کو لڑی میں پرو دیتے ہیں کہ ان کی شعری دنیا ایک مکمل اور جیتی جاگتی حقیقی دنیا معلوم ہوتی ہے۔

جدائی، صرف جسمانی دوری کا ہی نام نہیں بل کہ یہ دل کی تنہائی، روح کی بے قراری اور گزرے ہوئے وصل کے لمحات کے ٹھہر جانے کا المیہ ہے۔ ایسے ہی جذبات و احساسات کو بڑی مہارت اور گہرائی کے ساتھ اپنی شاعری میں جمیل حیات نے بیان کیا ہے اور ان کی شاعری لمحات فراق سے بھری پڑی ہے۔ جس کا مطالعہ کرنے سے قاری پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

جمیل حیات جدائی کے لمحات کو اس طرح صفحۂ قرطاس پر بکھیرتا ہے کہ قاری خود کو ان مناظر کا حصہ سمجھنے لگتا ہے۔ یہ شاعر کی بڑی کامیابی ہوتی ہے کہ وہ قاری کو اپنے کرب میں شریک کر لے۔ جمیل حیات کا رنگِ شاعری ہمیں ایک موڑ پر فراق کے ایک الگ اور اچھوتے انداز سے متعارف کراتا ہے۔ وہ جدائی کو صرف ہجر ہی تصور نہیں کرتا بل کہ یادوں کی مہک، چُپ اور ہر لمحے کی دھڑکن کے طور پر منظرِ عام پر لاتا ہے۔ ان

ماریہ اعجاز

کی شاعری میں وہ تمام لمحات ، مناظر کی صورت زندہ ہو جاتے ہیں جو عام قاری کی نظر میں محض چیز یا خیال کی حیثیت رکھتے ہیں۔
اکیسویں صدی کے شعرا میں ڈاکٹر جمیل حیات ایک حساس داستان گو شاعر کی حیثیت سے انفرادیت قائم رکھتا ہے۔اس کا شاعرانہ انداز بیان اس کے نام کی طرح دل آویز اور دلوں کے تار چھیڑنے والا ہے۔ اس کے ہاں وصل کا تصور دو جسموں کا ملاپ نہیں بل کہ دو روحوں اور اذہان کا ملاپ ہے۔اس کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ عشقِ مجازی سے ہوتے ہوئے عشقِ حقیقی تک جا پہنچتی ہے۔اس کے اشعار دل پر اثر انداز ہونے کے ساتھ ساتھ دعوت فکر بھی دیتے ہیں اور ان کی فراقیہ شاعری پڑھ کر انسان کو عشق کی راہوں میں سامنے آنے والی دشواریوں کا پتا چلتا ہے۔ جمیل حیات کے ہاں فراق بھی سرخوشی عطا کرتا ہے، تنہائی میں بھی حُسن پنہاں ہوتا ہے اور بچھڑنے کے بعد کی یادیں بھی وصل سے کم نہیں ہوتیں۔ایک اور بات جس کا اظہار کرنا میں مناسب سمجھتی ہوں کہ جمیل حیات کے ہاں عشق کا علوی تصور ہمارے سامنے آتا ہے۔ وہ محبت میں محبوب کو رسوا نہیں کرتا۔ یہ اشعار دیکھیے :

محبت جن سے ہوتی ہے انہیں رسوا نہیں کرتے
جو رنگ و نور جیسے ہوں انہیں میلا نہیں کرتے

بظاہر دور ہیں مجھ سے مگر دل کے قریں ایسے
جہاں جائیں جدھر جائیں ہمیں تنہا نہیں کرتے

.....

اس کی شاعری میں فراق کی کیفیات کے اظہار کے لیے خود کلامی کی تکنیک کا سہارا لیا گیا ہے۔ یہ انداز شعر کے فنی حُسن میں اضافہ کرتا ہے۔وہ بڑے احترام سے محبوب کی جفا، اس کی نظر انداز کرنے کی ادا کا گلہ کرتا ہے۔ یہ شعر دیکھیے :

جمیلؔ اتنا بتا دیں ہم وہ اب ملنے نہیں آتے
کہ بیمارِ محبت کو وہ اب اچھا نہیں کرتے

.....

ہجر کے موسم کی سختی کا سامنا کرتے ہوئے شاعر پر ایک ایسا وقت بھی آتا ہے کہ اس کے نزدیک وصل اور ہجر برابر ہو جاتے ہیں خوشی اور غم کے موسموں کو وہ ایک جیسا سمجھنے لگتا ہے۔اس دوران اگرچہ وہ ہجر کے تپتے صحرا میں تنہا ہوتا ہے لیکن اس پر ایک سرخوشی کی کیفیت طاری ہوتی ہے کیونکہ اب اس نے یادوں سے تعلق استوار کر لیا ہے۔شاعرا س کیفیت میں چُپ رہتا ہے۔ وہ کسی سے کوئی گلہ شکوہ نہیں کرتا بلکہ ہجر کو زندگی کا حصہ سمجھ کر یہ وقت بھی ہنسی خوشی طے کرتا ہے۔
جمیل حیات کی شاعری متنوع موضوعات کی حامل ہے اور وہ ہجر کے کئی رنگوں سے آشنا کراتا ہوا آگے نکل جاتا ہے یہ کچھ اشعار دیکھیے جہاں ہجر کی گوناں گوں

کیفیات کا بیان تو ہے ہی ان کے بین بین وصل بھی اپنے جلوے دکھاتا ہوا نظر آتا ہے:

آنکھ میں عکس سجا کر اس کا
صورتِ دہر بھلا دی ہم نے

.....

محبت کا یہ شیوہ ہے سرِ تسلیم خم کرنا
جسے دل میں بسانا ہو اسی کا ذکر کم کرنا

تری قربت کی خواہش میں یہی برسوں سے عادت ہے
نگاہِ شوق کو تیری طلب میں جام جم کرنا

.....

خواہشیں دل سے مٹا کر اب کے
تیری تصویر سجا دی ہم نے

.....

جمیل حیات کی شاعری میں یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ظاہری فاصلے کی کوئی وقعت نہیں بل کہ محبوب یہاں شاعر یا عاشق کے وجود میں اس قدر سرایت کیے ہوئے ہے کہ وہ اسے کہیں بھی تنہائی کا احساس نہیں دلاتا بل کہ وہ ہر سانس کے ساتھ اس کے دل میں دھڑکتا ہے۔ چنانچہ جسمانی فاصلہ محبوب سے عاشق کی محبت کو کم کر ہی نہیں سکتا بل کہ یہ چاہت ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ جمیل حیات کی شاعری میں یادِ محبوب، جذباتی قربت اور روحانی جذبۂ عشق اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ جمیل حیات کا اندازِ بیاں انتہائی سادہ اور عام فہم ہے۔ وہ قاری کو الفاظ کی گھسن گھیریوں کا شکار نہیں کرتا بل کہ سیدھے سادے انداز میں اپنی بات قاری تک پہنچانے کا فن جانتا ہے۔ وہ الفاظ کا چناؤ بڑی مہارت سے کرتا ہے۔ لفظ شعر میں اس طرح برتے گئے ہیں جیسے انگوٹھی میں نگینے۔ یہ چند شعر دیکھیے جو فراق لمحوں کی دلفریب داستان تو سناتے ہی ہیں سہلِ ممتنع کی لاجواب مثال بھی ہیں۔

ذرا ہمارا بھی حال دیکھو
کہ جیسے سُوکھے ہوئے شجر ہیں

.....

اک عذاب عظیم ہے دلبر
ہجر کی رات، بے کلی ، حسرت

آخری پل ، جمیل پُوری کر
دل میں رہتی تھی جو دبی حسرت

.....

بعد میرے ، ترا بنے گا کیا
اس حوالے سے بھی نہیں سوچا

ہم نے آخر جمیل مرنا ہے
باقی سوچا، یہی نہیں سوچا

.....

جمیل حیات کی شاعری میں فراق لمحوں میں امید کی کرن بھی نظر آتی ہے۔ وہ اس امید پر زندگی بتاتا ہے کہ کبھی نہ کبھی تو شاخِ امید ہری ہوگی اور وہ محبوب کے وصل یا اس کے دیدار سے شاد کام ہوگا۔ جمیل حیات یہاں بھی قاری کو نا امید

نہیں کرتا اور کچھ اس طرح کے اشعار اس کے قلم سے نکلتے ہیں:

میرے دل کی دھڑکن سے اک صدا سج جو اٹھتی ہے
آج ان کو لائے گی رات پُورے چاند کی

اس یقین پہ زندہ ہوں میں جمیل مدت سے
اک دفعہ تو آئے گی رات پورے چاند کی

.....

جمیل حیات محبت کرنے والا شاعر ہے، وہ اس محبت کا اظہار بھی کرتا ہے تو ہر بار اس کا انداز بیاں اچھوتا ہوتا ہے۔ وہ جہاں فراق لمحوں کو مہارت سے بیان کرنے پر قدرت رکھتا ہے وہیں وہ ایسی دل آویز انداز اختیار کرتا ہے کہ قاری کی زبان سے بے ساختہ دادِ تحسین کے کلمات ادا ہوتے ہیں۔ یہ اشعار دیکھیے:

کر گیا ہم کو اکیلا جو جمیلؔ
کُو بہ کُو اس کو صدا دی ہم نے

دھار کر روپ فقیروں کا جمیل
اس کی بستی میں صدا دی ہم نے

دردِ دل حد سے بڑھ گیا اب کے
درد دل کی دوا کرے گا کون

سانس لینا گراں ہوا ہے یہاں
زندگی کی دعا کرے گا کون

جمیل حیات نے عشقِ حقیقی میں ڈوبے ہوئے اشعار میں بھی فراق کے نت نئے جلوے بکھیرے ہیں اور اس انداز سے کہ دل خوش ہو جاتا ہے۔

فراقِ یار میں رونا ، فغانِ دم بہ دم کرنا
رُخِ جاناں کے ہر پرتو پہ میرا سر کو خم کرنا

.....

رتجگوں کی بستی میں قُمقُمے ہیں یادوں کے
قُمقُمے بجھائے گی رات پورے چاند کی

.....

سُن نہ لے راز محبت کوئی
مُہر ، ہونٹوں پہ لگا دی ہم نے
ہجر کا کرب بڑھا ہے اتنا
اس کی ہر یاد مٹا دی ہم نے
مسلکِ عشق پر قائم رہ کر
دوست دشمن کو دعا دی ہم نے

اور جب ہمارا یہ دلربا شاعر کہتا ہے کہ:

جمیل آساں نہیں دشتِ ہجراں سے گزر جاناں
کسی آہو کی صورت دم بہ دم پیہم ہے رَم کرنا

.....

تو ہجر کے میدان میں برہنہ پا چلتے شاعر کے کرب کا بہ خوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

جمیل حیات کا شعری مجموعہ ''حُسنِ لاریب'' کے نام سے ترتیب پا چکا ہے دعا ہے کہ جلد منصۂ شہود پر آئے اور قاری اس سے پوری طرح حظ اٹھا سکے۔

☆☆☆☆☆

نئی تقویم کا اشارہ

تمھاری دید کے دَم سے
سوا نظارہ ہے
یہ ارضِ پاک
کسی آسماں کا پارہ ہے

یہ کوئی عکس نہیں
صرف سبز پرچم پر
زمیں پہ اُترا ہوا
اصل چاند تارا ہے

ہے دُکھ اُنھیں
کہ میں مایوس کیوں نہیں ہوتا
بھنور بھی کیوں
مجھے اک صورتِ کنارہ ہے

بہت خجل ہوئے
پیچھے دھکیلنے والے
سمے نے پھر ہمیں
پہلی صفوں شمارا ہے

ہے صبح و شام
رگوں میں رواں لہو کی طرح
یہ اپنا عشق ہے
اور جان سے بھی پیارا ہے

تصرّف ایک طرف،
دسترس بھی کب اُس کو
یہ دل نہیں
مری مرضی کا استعارہ ہے

اک ایک جنبشِ چشم اپنی
اِن دنوں عالی
سرِ زماں
نئی تقویم کا اشارہ ہے

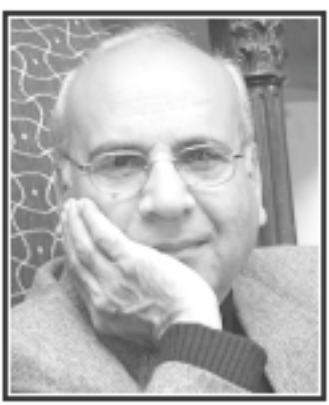

جلیل عالی

جیٹ لیگ

میں آئی تھی واپس۔۔۔
اُسی کہکشاں پر
جہاں پر مداروں کے رستے کٹے تھے
جہاں دن بٹے تھے۔۔۔
مرے کچھ زمانے
محبت کا فرغل لپیٹے
جدائی کی جیبوں میں لمحوں کو اُڑسے
اُڑے جا رہے تھے......
جہاں ثبت تھے،
کچھ قدم تھے تمہارے،
سفر تھے ہمارے
وہاں دھول تھی، بخت تھا
مرحلہ سخت تھا......
میں آئی تھی واپس......
مگر کچھ نہیں تھا،
سوکھا شجر تھا
ہجر کا، وصل کا، ہر نشاں مٹ گیا تھا
......ہری سانس کی ایک ڈوری میں
اپنی دعا باندھ کر
شاخ پر ٹانگ کر
میں چوراہے کے ایک جانب کھڑی ہوں
ہرے، لال، پیلے نشاں دیکھتی ہوں
نجانے کسے......؟ میں کسے ڈھونڈتی ہوں!!

شبہ طراز

تئیس مارچ

گونج فرمانِ قائد کی تھی ہر طرف
روئے تاریخ کو یُوں سنوارا گیا

سب کے ہونٹوں پہ تھی سَرخوشی ہر طرف
ہر ورق صدقِ دل سے نکھارا گیا

اور پھیلی تھی اِک روشنی ہر طرف
اور طوقِ غلامی اتارا گیا

صبحِ نَو میں ڈھلی تھی شبِ بے بسی
چارہ گر بَن گیا سیلِ بے چارگی

مارچ آیا تھا لے کر نئی زندگی
مارچ آیا تھا لے کر نئی زندگی

خوابِ اقبال کو اس کی تعبیر کو
حرفِ تحریر کو نفسِ تقریر کو

حق کی تصویر کو عزمِ تعمیر کو
مل گئی تھی ستاروں کی تابندگی

مارچ آیا تھا لے کر نئی زندگی

خون بو کر اُگایا تھا یہ گلستاں
ہر مسلماں کو بھایا تھا یہ گُلستاں

جب بہاروں پہ آیا تھا یہ گُلستاں
چھائی تھی دشمنوں پر سراسیمگی

مارچ آیا تھا لے کر نئی زندگی

اکرم سحر فارانی

اب ایسا نہیں ہوگا!

اب ایسا نہیں ہوگا!
تم آؤ تو،
دل کی شریانوں میں سازنیہ سا بجنے لگ جائے
یکسر اِک ہلچل سی مچنے لگ جائے
آنکھیں، تم کو دیکھ کے چمک اُٹھیں،
ہونٹ پھڑک اُٹھیں
اُنگلیاں، لمس کی آگ میں جلنے لگ جائیں
خواہشیں، پاگل کرنے لگ جائیں
سینے میں سانسوں کا شور مسلسل بڑھتا جائے
جی، بے خُود ہو جائے اور مچلتا جائے
ٹھنڈے، میٹھے، ہنستے بولتے لمحے،
گُل پاشی کرتے رہ جائیں
باتیں، اِتنی!
ختم نہ ہونے میں آئیں
اب ایسا نہیں ہوگا!

O

غور سے دیکھو!
میں، اب اُسی عمارت کے مَلبے پہ کھڑا ہوں
جس کو ہم نے،
لمحہ لمحہ جوڑ کے خُود تعمیر کیا تھا
ایک پُرانا خواب، جسے تعبیر کیا تھا
اب اِس ملبے سے دوبارہ،
اُسی عمارت کی تشکیل نہیں ہو سکتی
منظر نامے کی یہ ہیئت،
کبھی تبدیل نہیں ہو سکتی

O

اِتنا یاد رکھو!
چڑھتے ہوئے دریا کے کٹاؤ، کبھی نہیں بھرتے
زہریلی باتوں کے گھاؤ، کبھی نہیں بھرتے

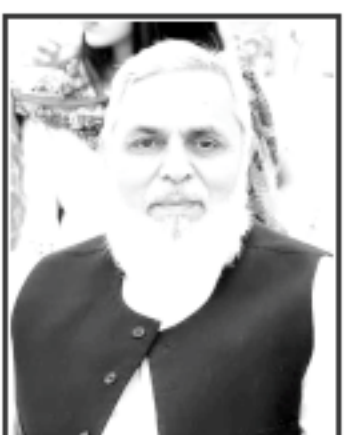

محمد انیس انصاری

نثری نظم

مصروفیت جذبے نگل لیتی ہے
وقت نہیں ملتا
ہم چاہ کر بھی مل نہیں پاتے
ان کہی باتیں فراموشی کی دھند میں کھو جاتی ہیں
گفتگو میں تعطل
دوریاں بڑھانے کا سبب بن جاتا ہے
رستے
فراموشی کی گرد سے اَٹے رہتے ہیں

قدم واپسی کا رستہ بھول جاتے ہیں
ملاقات اب رسماً ہوی ہے
جو محبت وقت کی دوڑ میں پیچھے رہ جائے
پھر نہیں ملتی
ہم ایک دوسرے کے چہرے پر گزشتہ زمانو کی
پرچھائیاں تلاشتے رہتے ہیں

فاصلے کم نہیں ہوتے
مصروفیت جو پل نگل لیتی ہے
پھر لوٹ کر نہیں آتے
بوسیدہ تعلق
کی عمارت کسی بھی لمحے
زمین بوس ہو سکتی ہے
ہم جانتے ہیں
اسی لیے اجنبیت کے شیلٹر میں جا چھپتے ہیں
جہاں فاصلے معنی نہیں رکھتے
لہجوں کی چبھن تکلیف دہ نہیں ہوتی

نائلہ راٹھور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جنگ دو گز زمین کی خالد
ہم نے اک عمر لڑ کے ہاری ہے

تنہائی کی آخری سچائی

یہ نظم اُس موڑ کی کہانی ہے
جہاں انسان زندگی کے شور میں
اپنی ہی آواز کھو دیتا ہے
اور پھر ایک دن
تھکن کی آخری حد پر آ کر
خاموش ہو جاتا ہے
اور خود سے بات کرنا سیکھ لیتا ہے
جہاں تعلقات کی بھیڑ
دل پر بوجھ بن کر اُترتی ہے
جہاں لوگ بہت ہوتے ہیں
مگر اپنا پن ناپید ہو جاتا ہے
اور انسان ہجوم میں رہ کر بھی
سکون کہیں اور ڈھونڈنے لگتا ہے
یہ اُن لمحوں کا بیان ہے
جب انسان سمجھ لیتا ہے
کہ ہر قربت مرہم نہیں بنتی
اور ہر دوری زخم نہیں ہوتی
ایک وقت ایسا بھی آتا ہے
کہ ہجوم شور نہیں رہتا
سانس گھٹنے لگتا ہے
مسکراہٹیں سچ نہیں
ضرورت لگتی ہیں
اور گفتگو میں لفظ تو ہوتے ہیں
مگر دل کہیں اور چھپا ہوتا ہے
تعلقات قائم رہتے ہیں
مگر انسان غائب ہو جاتا ہے
تب انسان آہستہ آہستہ
لوگوں سے نہیں
خود کو بکھرنے سے بچانے لگتا ہے
خاموشی کی زبان
تب سمجھ آتی ہے
جب بولنا
اپنی ہی نفی لگنے لگے
اور تنہائی
تلخ نہیں رہتی
صاف ہو جاتی ہے
کیونکہ وہاں خود فریبی کی گنجائش نہیں ہوتی
دل کی خوشی

تب قہقہوں میں نہیں
بلکہ اس لمحے میں ملتی ہے
جب کسی کو خوش رکھنے کی ذمہ داری
دل سے اُتر جائے
انسان جان لیتا ہے
کہ ہر دروازہ کھٹکھٹانا
اپنی بے وقعتی کا اعلان ہے
اور ہر ہاتھ تھامنا
محفوظ ہونے کی دلیل نہیں
تنہائی
کمزوری نہیں
یہ وہ مقام ہے
جہاں انسان
اپنے وجود کے سامنے
اکیلا کھڑا ہوتا ہے
بغیر کسی سہارا
بغیر کسی گواہ
اور پھر ایک دن
لوگوں سے دور ہو کر
انسان یہ سچ قبول کر لیتا ہے
کہ وہ کبھی واقعی سمجھا ہی نہیں گیا
مگر اسی لمحے
وہ پہلی بار
خود کو جھوٹ نہیں کہتا
اور یہی لمحہ
اس کی سب سے بڑی
اور سب سے مہنگی آزادی بن جاتا ہے

سید فرخ رضا ترمذی

''راکھ اوڑھے انگارے'' [نثری نظم]

اندر اور باہر
یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے
گریباں چاک چاک
پیراہن تار تار
درد،
اذیت ہے،
سہنا کتنا مشکل ہوتا ہے
جب کسی اپنے کو تکلیف میں
دیکھتا ہوں
تو بے چین ہو جاتا ہوں
اندر لگی آگ کو پانی بھی
نہیں بجھا سکتا
یہ میں بھی جانتا ہوں

صدیوں پرانے زخم کبھی
لمحوں میں مندمل ہوئے ہیں کیا؟
نہیں نا!

میں ہنستا ہوں
لوگ سمجھتے ہیں
سب ٹھیک ہے
مگر جو اپنی
آنکھوں کے سامنے
ٹوٹتا ہو،
اس کے لیے
خود کو سنبھالنا بھی
ایک زخم ہوتا ہے

شبیر آکاش

بکھرنے کا خوف

خالق آرزو

خزاں آنے سے پہلے میری ہستی
اک برگ سبز کی صورت مہکتی تھی
کہ میں اک سبز پتا تھا
چمکتی اوس کی بوندیں مری ہستی کو پیہم تازہ رکھتی تھیں
ہوا کے پُر فضا جھونکوں سے جب میں لہلہاتا تھا
تو ہر منظر مری زندگی پر مسکراتا تھا
مگر اب زرد رُت آنے سے میں اک زرد پتا بن گیا ہوں
تیز آندھی نے مجھے
اک شاخ سے نیچے پٹخ ڈالا
مہکتی اوس کی نرمی مرے دامن سے باہر پھینک دی ہے
جسم میرا زرد رُت کے کھردرے چانٹوں نے
اتنا چھید ڈالا ہے
کہ کوئی جو نرمی سے بھی چھوئے تو
میں یکسر ٹوٹ سکتا ہوں
بکھر بھی سکتا ہوں
اور بکھراؤ کے ڈر سے بدن میرا لرزتا ہے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

مجھ پہ ترے غم کا سائبان رہا ہے
دشت میں بھی سر پہ آسمان رہا ہے

ہم زاد [نثری نظم]

ہنزہ کی جانب جانے والی فراٹے بھرتی گاڑی

سرمئی سڑک کی دونوں جانب

گھنے درخت

جن کی چھاؤں کی ٹھنڈک کا ذائقہ انمول مگر

انہیں درختوں کی آخری ٹہنی سے لٹکے پتے

میرے ہمزاد بنتے ہیں

کھلے، بکھرے، سنہری آسمان تلے

آگ برساتے سورج کو

تنہا اپنے بدن پر جھیلتے ہیں

بشریٰ شیریں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اہل زنداں کے لیے تازہ ہوا آنے کو ہے
شہر جاناں سے کوئی تازہ نوا آنے کو ہے

لفظوں سے خالی ای میل [نثری نظم]

ای میل میں
لکھا ہے کہ
کتابیں گواہ ہیں
مگر
لوگوں کے رویّے
زبانوں کے لہجے
آنکھوں کی اجنبیت
اس گواہی کو مشکوک بنا رہی ہے

ہم
اپنے لکھے کے مطابق
کہاں جیتے ہیں
اور اُس سمت کیوں نہیں بڑھتے
جو کبھی سنگِ میل بن کر
ہمارے ذہن کی دنیا میں
راستے کا یقین بن کر آیا تھا

ہم ڈرنے والے نہیں
لیکن
خوف کے عادی ہو چکے ہیں
اپنے اردگرد
طاقت کے بے چہرہ نظام کو
روز دیکھتے ہوئے
سسکتے ہیں

ہم خاموش
بزدلی کے محفوظ دائرے میں
گم نام رہتے ہیں
اور آہستہ آہستہ
یہ بھول جاتے ہیں
کہ ہم نے کتابوں میں
کیا پڑھا تھا

امجد بابر

پہلی بارش [نثری نظم]

بارش کی پہلی بوند، جب تمھارے بدن سے لگی
میرے دل میں جیسے ایک نیا راستہ بنا
خواب کی طرح نرم، دلکش اور چھپی ہوئی
ہر قطرہ تمھاری مسکان کی عکاسی کرتا رہا

ہوا کے ساتھ تمھاری ہنسی نے کھیل کھیلا
اور میرے دل کے سنسان گوشے روشن ہو گئے
سچے عشق کی پہلی بارش، یہ نرمی
میرے وجود کو چھو کر گزر گئی

میں نے چاہا، یہ لمحہ کبھی نہ ختم ہو
یہ چھوٹی خوشی، یہ خاموش محبت
میرے دل کے ہر کمرے میں بسی ہوئی
اور تمھارے نام کی روشنی ہر سو پھیلی ہوئی ہے

نعمان منظور

محمد سلیم ساگر
میں کہانی میں لاپتا ہوا تھا

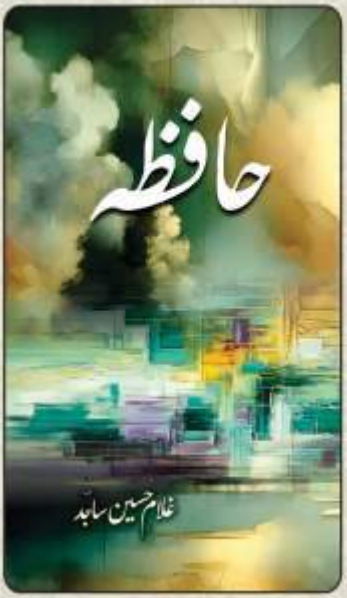
حافظہ
غلام حسین ساجد

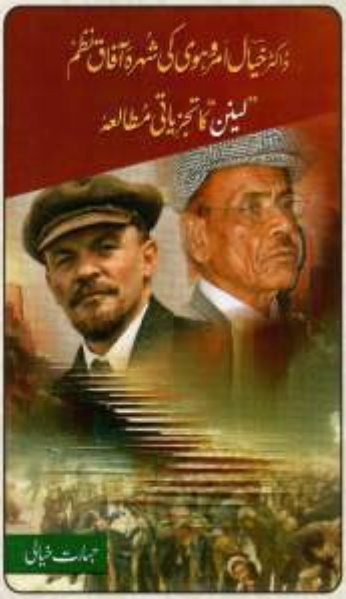
ڈاکٹر خیال امروہوی کی شہرۂ آفاق نظم
"لینن" کا تجزیاتی مطالعہ
تجزیات خیالی

مُیسّر
(شعری مجموعہ)
محمد آصف انصاری

تشبیب
خالد احمد
ایک مٹھی ہوا
خالد احمد
جدید تر پاکستانی ادب
خالد احمد
نم گرفتہ
دراز پلکوں کے سائے سائے
خالد احمد
عرض ہنر
خالد احمد